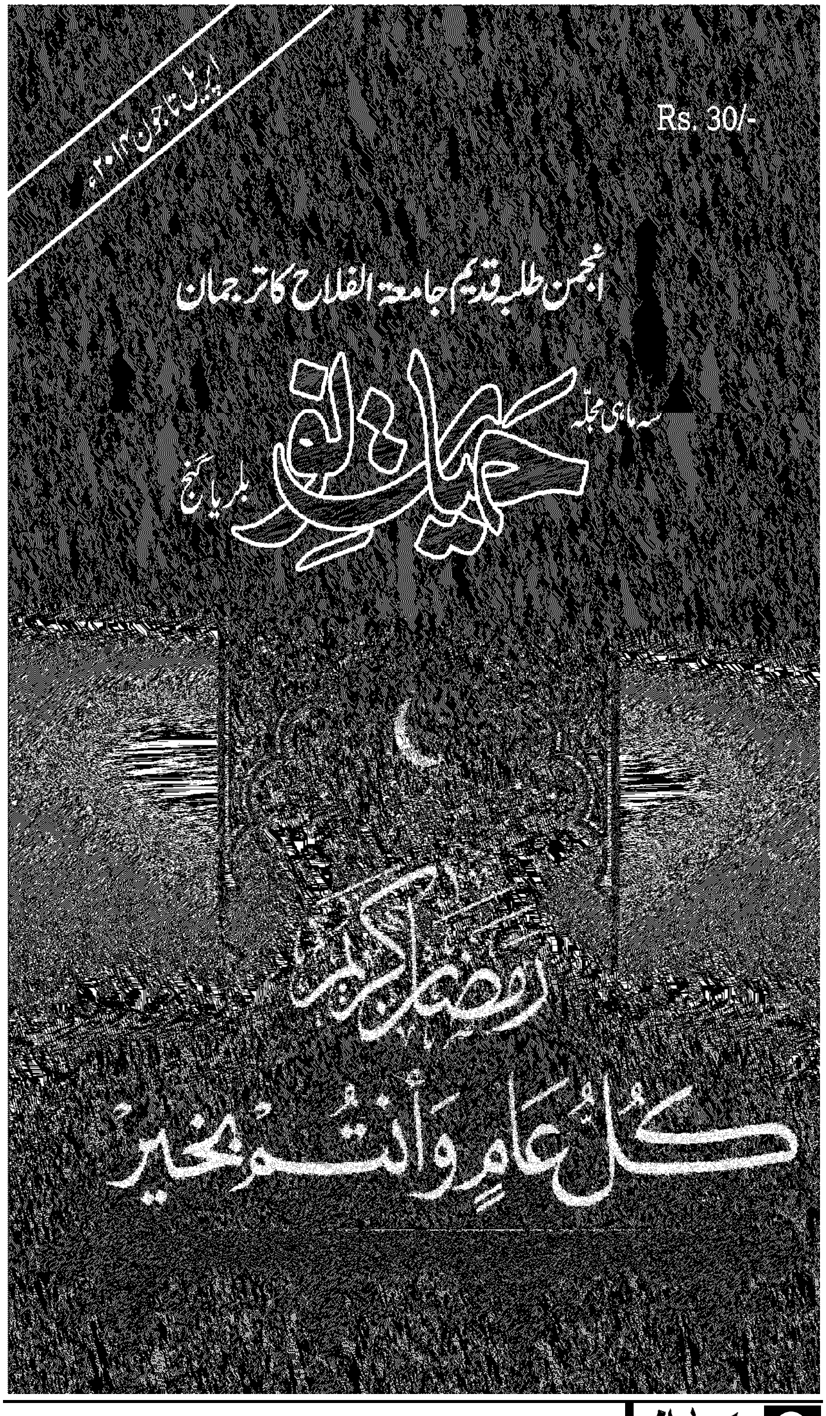
اپریل تا جون ۲۰۱۴ء
Rs. 30/-
انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان
سہ ماہی مجلہ
حیاتِ نو
بلریا گنج
رمضان کریم
كل عامٍ وأنتم بخير

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۲۸، شمارہ:۲، اپریل-جون ۲۰۱۴ء/جمادی الاول-رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... جامعۃ الفلاح

سید راشد حامدی فلاحی ...... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	:اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	:اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور

ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی

abulaalasubhani@gmail.com

+91-9891051676

برائے انتظامی امور وترسیل زر

عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

اعظم گڑھ (یوپی) 276121

+91-9453757380

hayatenau5@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۵
رمضان کی نوری راتوں میں	سید راشد حامدی فلاحی	۷
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	نسیم احمد غازی فلاحی	۹
ہمارے زمانے کا جامعہ	ظفر اثری فلاحی	۱۵
لا کہیں سے ڈھونڈ کر۔۔۔	محمد اسماعیل فلاحی	۲۲
مدارس اسلامیہ اور ہندوستانی زبانوں کی تدریس	عبدالحق فلاحی	۲۸
	رضوان احمد فلاحی	۳۱
	پروفیسر محمد اسحاق	۳۲
	انیس احمد فلاحی مدنی	۳۴
	نعمان بدر فلاحی	۳۵
	ضمیر الحسن خاں فلاحی	۳۸
	فیضان شاہد فلاحی	۴۱
	ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی	۴۳
	جوہر جاوید فلاحی	۴۷
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۴)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۵۱
شفق طاہری کے نعتیہ کلام کی معنوی جہتیں	نعیم احمد غازی فلاحی	۶۴
کیا مسافر تھے۔۔۔	ماسٹر شاہ عالم فلاحی	۶۹
تعارف وتبصرہ	عبدالرحمٰن خالد فلاحی	۷۱
آپ کے خطوط	قارئین	۷۴
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۷۷
اخبار انجمن	ادارہ	۸۱

اپنی بات

گزشتہ دنوں استاذ محترم مولانا محمد اسماعیل فلاحی (حفظہ اللہ ورعاہ) کے ہمراہ پٹنہ (بہار) جانے کا اتفاق ہوا۔اعظم گڑھ سے بذریعہ ٹرین حاجی پور کے لیے روانہ ہوئے۔ٹرین میں معمول کے مطابق مختلف قسم کے واقعات پیش آئے،تاہم سامنے کی سیٹوں پر بیٹھے چند مسافروں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔

یہ ۳؍نوجوان (۲؍لڑکے اور ۱؍لڑکی) تھے، دیکھنے میں یونہی عام سے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔تاہم جب ان سے تعارف ہوا،اور مختلف موضوعات پر گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی ذہین قسم کے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔سماجی مسائل کے سلسلے میں ان کے اندر کافی حساسیت پائی جاتی ہے۔رہنے والے گورکھالینڈ کے ہیں،لیکن ایک طویل عرصے سے اعظم گڑھ کے ایک مشنری اسکول میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ہندی زبان سے معمولی واقفیت رکھتے ہیں،تاہم یہاں کے چپے چپے سے بخوبی واقف ہیں۔

یہ محض تین نوجوان تھے، ان نوجوانوں کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں،شہری علاقوں سے دور دیہاتی اور جنگلی علاقوں تک میں، نہ جانے کتنے ذہین اور اعلی تعلیم یافتہ نوجوان ہیں، جو مادی ترقیوں اور جدید سہولتوں کو بڑے شہروں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں میں تلاش کرنے کے بجائے ''کچھ عظیم ترین مقاصد'' کے تحت اِن علاقوں میں مقیم ہیں۔

اس وقت عیسائی مشنریز ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ جس علاقے میں بھی کام کرتی ہیں،عموماًان کا ایجنڈہ معیاری تعلیم کی فراہمی اور بڑے پیمانے پر خدمت خلق کا کام ہوتا ہے۔ان سرگرمیوں کے ذریعہ فی الواقع وہ اپنے حقیقی مشن کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ یہ مشن اپنی تہذیب کا فروغ اور اپنے مذہب کی اشاعت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ مشنریاں اپنے مقاصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں،تعلیم اور خدمت خلق کے میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اپنی تہذیب کے فروغ اور مذہب کی اشاعت میں بھی یہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

عیسائی مشنریز کی جانب سے اس سخت اور صبر آزما جدوجہد پر طرح طرح کے تبصرے سننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ 'تعلیم اور خدمت خلق کے نام پر یہ مشنریز نئی نسل کو تباہی کی طرف لے جارہی ہیں'۔'مغربی تہذیب کی جانب سے زبردست یلغار ہے، اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے'۔'ملک کی غربت اور بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائی مذہب کے فروغ کا کام کیا جارہاہے'،وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کا ردِعمل یکسر منفی سوچ کا نتیجہ ہے، اس سے سماج میں شکایت کا مزاج تو پروان چڑھ سکتا ہے، تاہم کام کرنے کا جذبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ کام کرنے والوں کے یہاں شکوہ وشکایت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ دنیا کسی کی بھی نہیں ہے اور سب کی ہے۔ کسی کی نہیں ہے کیونکہ یہاں کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کو اپنے فکر اور عقیدے کو زبردستی ماننے پر مجبور کردے، اور سب کی ہے کیونکہ ہر کسی کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے فکر اور عقیدے کی اشاعت اور فروغ کے لیے جائز وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے میدانِ عمل میں جدوجہد کرے۔

آج ملت اسلامیہ ہند اور اس کے مختلف اداروں کا اس پہلو سے بے لاگ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ان کے پاس بھی کوئی مشن ہے۔ کیا ملت کے اداروں (بالخصوص تعلیمی، خواہ دینی ہوں یا عصری) میں اس پہلو سے کسی قسم کی یک جہتی پائی جاتی ہے کہ وہ ایک مشن کے علمبردار، یا اس کا حصہ ہیں۔ کیا اِن تعلیمی اداروں میں آنے والے طلبہ اپنی عمر کے سالہاسال گزارنے کے بعد بھی کسی مشن کے حامل بن پاتے ہیں۔ ملت کی تنظیموں اور جماعتوں کے سلسلے میں بھی سوال اٹھتا ہے کہ کیا اُن کے پاس سماج اور سماجی مسائل کے سلسلے میں کوئی واضح اور مثبت ایجنڈہ موجود ہے۔ کیا ملت اسلامیہ ہند کے پاس اپنی تہذیب واقدار اور اپنے مذہب کے فروغ واشاعت کے لیے بھی کوئی پروگرام پایا جاتا ہے۔ کیا ملت اسلامیہ کی موجودہ صورتحال اور اس کی مجموعی سرگرمیاں اس کے منصبِ امامت کے ساتھ کسی بھی طرح میل کھاتی ہیں۔ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں، جو اس ذیل میں سامنے آتے ہیں۔

اس جائزہ کا کام کسی بھی سطح پر کیا جائے، عام افرادِ ملت کے درمیان، یا ملت کے مختلف اداروں اور تنظیموں کے درمیان، اس کے نتیجے میں بہت ہی افسوسناک صورتحال سامنے آتی ہے۔ بے مقصدیت کا آغاز فردِ ملت سے ہوتا ہے، اور پھر عام معاشرے کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی پوری ملی قیادت اس کی زد میں آجاتی ہے۔

ملک کے حالات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہورہے ہیں۔ انتخابات ۲۰۱۴ء کے نتائج منظرعام پر آچکے ہیں۔ بی جے پی نے اس موقع پر تاریخی کامیابی درج کی ہے، جبکہ کانگریس کو غیر معمولی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر مختلف قسم کے تجزیے سامنے آرہے ہیں، جن میں اس فتح وشکست کے اسباب وعوامل پر گفتگو کی جارہی ہے۔ پارلیمنٹ میں مسلم نمائندگی کا مسئلہ بھی زیر بحث ہے۔ ضرورت ہے کہ اس موقع پر ملت کی موجودہ صورتحال اور ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں اس کے مطلوبہ کردار کے تعلق سے کھل کر گفتگو کی جائے۔ مواقع کی ایک وسیع دنیا ہے، جو آج بھی منصب امامت کا صحیح شعور رکھنے والوں کی منتظر ہے، لیکن یہ انتظار کب تک جاری رہے گا، نہیں معلوم۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

رمضان کی نوری راتوں میں

سید راشد حامدی فلاحی، دہلی۔موبائل نمبر:09811126467)

رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں
مومن کے لبوں پرشام و سحر قرآن کے جلوے بکھرے ہیں
مہتابِ ہدایت چمکا ہے ، راتوں کے مقدر ہیں روشن
تاریکیِ شب ہے شرمندہ ، ایمان کے جذبے بکھرے ہیں

پیشانیِ مومن ہے روشن ، سجدوں کے ستارے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

سر شوقِ اطاعت میں خم ہے ، آنکھوں سے عبادت جاری ہے
اس ماہِ مبارک میں ہر پل قرآں کی تلاوت جاری ہے
نیکی کا بدی پر غلبہ ہے ، ایمان کا ہر سو جلوہ ہے
شیطان مقید ہوتا ہے، رحمان کی قدرت جاری ہے

رمضانِ مقدس کیا آیا ، شیطان کے ٹکڑے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

اللہ ضیافت کرتا ہے رمضان میں روزہ داروں کی
لاتے ہیں ملائک افطاری ، اللہ کے تابع داروں کی
اخلاص کی جس میں خوشبو ہو ، وہ کام خدا کو پیارا ہے
ہے مشک سے بہتر بوئے دہن ، اللہ کو اپنے پیاروں کی

خوشبو سے معطر ہے منظر ، پھولوں کے نظارے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

پُر نور مساجد رہتی ہیں ، ملحد بھی مسلماں لگتا ہے
رمضانِ مبارک آتے ہی ، اسلام کا خواہاں لگتا ہے
جو راہِ مبیں سے بھٹکا تھا نادم ہے گناہوں پر اپنے
عقبیٰ پہ نگاہیں اٹکی ہیں ، ہر لمحہ پشیماں لگتا ہے

کیا خوب نوازش ہے اُس کی، رحمت کے خزانے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

کچھ بھوکے پیاسے رہتے ہیں، کچھ لوگ دکھاوا کرتے ہیں
تقویٰ کی روش ہے اُن کو کٹھن ، ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں
اللہ کو اُن کی کیا حاجت ، رمضان سے اُن کو کیا نسبت
جو مقصدِ رمضاں بھول گئے ، بس آقا آقا کرتے ہیں

اے شافعِ محشر! تو ہی بتا کیوں قوم کے ٹکڑے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

رمضان سنہری موقع ہے ، اب دامنِ عصیاں دھو ڈالو
ہے رحمتِ باری جلوہ فگن ، ایمان و یقیں کے متوالو
خوشنودیِ خالق کی خاطر ، بندوں سے محبت ہے لازم
ہر سمت اُجالا ہوجائے ، اخلاق کے درپن چمکالو

راشدؔ بھی کرم کا خواہاں ہے اشکوں کے ستارے بکھرے ہیں
رمضان کی نوری راتوں میں جنت کے نظارے بکھرے ہیں

....

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

نسیم احمد غازی فلاحی، مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی

(۱)

یوپی کے ایک شہر کے تعلیم یافتہ ہندو خاندان کی ایک لڑکی کالج میں اپنی مسلم سہیلیوں کے رابطے میں آکر اسلام سے متعارف ہوئی اور آخر ایک دن اس نے قبول اسلام کا ارادہ کرلیا۔ اپنے اس ارادے کا تذکرہ اس لڑکی نے اپنے باپ سے کیا۔ باپ کو اس خبر سے دلی شاک لگا مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی اندرونی کیفیت کے برعکس اپنی بیٹی کی قابلیت کی تعریف کرتے ہوئے اس سے کہا کہ بیٹی! مجھے تمہاری عقل و دانش پر بھروسہ ہے۔ میں نے تمھیں تعلیم اسی لیے دلائی ہے کہ تم جو فیصلہ کروگی سوچ سمجھ کر صحیح فیصلہ کرو گی۔ اگر تم نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہماری خوشی تمہاری خوشی میں ہے اور ہم تمہاری خواہش اور خوشی کی تکمیل میں مزاحم نہیں ہوسکتے۔ ہمیں تم سے دلی محبت ہے، تم ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اس لیے ہم تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہیں۔

لڑکی نے باپ کی زبان سے اپنے بارے میں یہ کلمات سن کر اطمینان کی سانس لی اور وہ خوش ہوگئی کہ وہ اپنے ارادے کی تکمیل اب بآسانی کر سکے گی۔

اس لڑکی کے باپ نے دکھانے کے لیے تو یہ حوصلہ افزا باتیں اپنی بیٹی سے کہہ دیں مگر وہ اندر ہی اندر بے چین اور فکر مند ہوگیا۔ اس نے بیٹی کے مستقبل کے لیے جو حسین خواب دیکھے تھے اسے وہ سب چکنا چور ہوتے نظر آرہے تھے۔ نیز سماج اور خاندان میں رسوائی کا اندیشہ الگ تھا۔ اس کے خیال میں اگر لڑکی مسلمان ہوگئی تو سماج میں اس کی ناک کٹ جائے گی اور عزت خاک میں مل جائے گا۔ اس لیے اس کے دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔ مگر بیٹی کے سامنے اپنی اس بے چینی اور اضطراب کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ البتہ بیٹی کو اس ''گمراہی'' سے بچانے کی تدبیر برابر سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے زور زبردستی سے اس 'حرکت' سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے لیے تو کوئی نفسیاتی اور حکیمانہ تدبیر ہی کارگر ہوسکتی ہے۔

ایک روز اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ جب وہ کالج سے واپس آئے تو فلاں مارکیٹ سے پانچ کلو

آم لیتی آئے۔ بیٹی بائک سے کالج آتی جاتی تھی، چنانچہ باپ کے کہنے کے مطابق شام کو وہ آم لے کر گھر آ گئی۔اس کے باپ گھر پر موجود تھے،انہوں نے بیٹی سے کہا کہ ان آموں کو پانی کی بالٹی میں ڈال دو تا کہ وہ ٹھنڈے ہو جائیں۔ بیٹی نے فوراً آم کی تھیلی پانی کی بالٹی میں الٹ دی۔اس نے جیسے ہی آم بالٹی میں ڈالے وہ چونک پڑی اور باپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ میں نے تو یہ آم چھانٹ کر تھیلی میں ڈالے تھے مگر کیا دیکھتی ہوں کہ اس میں آدھے سے زیادہ آم خراب ہیں۔ یہ تو بڑا دھوکہ ہو گیا۔ یہ کہہ کر بیٹی اپنے کو مجرم سمجھتے ہوئے خاموش ہوگئی۔اس کے باپ نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے یہ آم کہاں سے خریدے ہیں؟ بیٹی نے بتایا کہ آپ کی بتائی ہوئی مارکیٹ سے ایک میاں جی کی دوکان سے خریدے ہیں۔ یہ سن کر باپ نے اس سے کہا کہ بیٹی! یہ آم لے کر فوراً بائک سے چلی جاؤ اور انہیں واپس کر کے دوسرے آم لے آؤ۔لڑکی وہ آم لے کر اسی دوکاندار کے پاس گئی جس سے اس نے آم خریدے تھے اور اس سے آم خراب ہونے کی بات کہی۔ دوکاندار نے اس پر حیرت اور ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا سرے سے انکار ہی کر دیا کہ اس نے یہ آم اس کی دوکان سے خریدے ہیں۔ وہ لڑکی اس جواب سے ہکا بکا رہ گئی اور مایوس ہو کر گھر واپس آ گئی۔ گھر پہنچ کر پوری بات اس نے اپنے باپ کو بتائی اور اداس ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔اس کے باپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے لیے بالکل دلبرداشتہ نہ ہو اور اس بات کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دے۔اس طرح کے چھوٹے موٹے نقصانات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔اس لیے اسے اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بات آئی گئی ہوگئی اور سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ایک دن رات کو حسب معمول اس لڑکی کے باپ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔اسی کمرے میں قریب ہی وہ لڑکی بھی سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ کچھ رات گزرنے کے بعد اس لڑکی نے محسوس کیا کہ اس کے باپ کروٹیں بدل رہے ہیں اور کبھی کبھار ان کی زبان سے بے چینی کے ساتھ کچھ الفاظ بھی نکل رہے ہیں۔لڑکی نے سمجھا کہ شاید ان کی طبیعت خراب ہے،اس لیے وہ بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔

اس نے اپنے باپ سے ان کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے البتہ نیند نہیں آ رہی ہے۔انہوں نے لڑکی سے یہ بھی کہا کہ وہ آرام سے سو جائے اور ان کی فکر نہ کرے۔ جب نیند آئے گی تو وہ سو جائیں گے۔لڑکی اپنے بستر پر واپس چلی گئی۔اس کے باپ کی بے چینی اور بے قراری اور زیادہ بڑھنے لگی اور وہ پہلے سے زیادہ کراہنے کی آواز نکالنے لگے اور کروٹیں بدلنے لگے۔لڑکی آواز سن کر پھر ان کے پاس گئی اور ان سے ان کی تکلیف معلوم کی۔ باپ نے پھر وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا اور لڑکی پھر اپنے بستر پر آ گئی۔تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی کراہنے اور

بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلنے کی آواز آئی تو لڑکی پھر اپنے باپ کے پاس گئی اور ان سے باصرار اپنی پریشانی بیان کرنے کی درخواست کی تا کہ اگر ضرورت ہو تو کسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا جا سکے۔ اب اس کے باپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ اسے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے ہی درد بھرے انداز میں اپنی بیٹی سے اپنی بے چینی اور بے قراری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا:

''بیٹی! مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو۔ تمہیں میں نے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے۔ اسی لیے میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب چند روز قبل تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مسلمان ہونا چاہتی ہو تو میں نے تمہاری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے تمہیں اس کی بخوشی اجازت دے دی تھی۔ مگر آم والا جو واقعہ تمہارے ساتھ پیش آیا تو اس نے مجھے بے چین کر دیا اور میری راتوں کی نیند اڑا دی۔''

بیٹی نے فوراً کہا کہ پاپا وہ تو چند روپیوں کا نقصان تھا، اس پر آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ اس پر اس کے والد نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا، بیٹی! چند روپیوں کے نقصان پر میں پریشان نہیں ہوں بلکہ میری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔ یہ کہہ کر لڑکی کے والد رونے لگے۔ لڑکی نے انہیں چپ کرایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی پریشانی اس سے بلا تکلف بیان کریں۔ باپ نے بڑے ہی درد بھرے انداز میں آہیں بھرتے ہوئے کہا کہ بیٹی! دراصل یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے کہ صرف کچھ آموں کے لیے ایک مسلمان نے تمہیں دھوکہ دیا۔ پہلے تو اس نے آنکھیں بچا کر گلے سڑے آم تمھیں دے دیئے اور جب تم انھیں بدلنے کے لیے اس کے پاس گئیں تو اس نے جھوٹ بول کر صاف انکار کر دیا کہ وہ آم تم نے اس سے خریدے ہیں۔ اس واقعہ سے مجھے اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں مسلمان بن جانے کے بعد مسلمان تمہارے ساتھ دھوکہ نہ کر دیں۔ تمہارا استحصال کر کے تمہیں مکھی کی طرح دودھ سے نکال کر پھینک نہ دیں۔ مسلمان بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ اس کا مشاہدہ تم نے خود کر لیا۔ میری پیاری بیٹی! چند کلو آم کا نقصان میرے لیے کوئی نقصان نہیں ہے البتہ اگر تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ ہو گیا تو اسے میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ بس انہیں باتوں کو سوچ سوچ کر میں پریشان ہو رہا ہوں اور اسی بات نے میری نیند اڑا دی ہے۔ یہ کہتے کہتے اس لڑکی کے باپ پھر آبدیدہ ہو گئے اور ماحول کافی جذباتی ہو گیا۔

اسلام اور مسلم سماج کے بارے میں اس لڑکی کا کوئی وسیع مطالعہ نہ تھا، اس لیے باپ کی گفتگو سے وہ متأثر ہو گئی اور اسے بھی باپ کی بات میں وزن نظر آنے لگا اور وہ بھی اس اندیشے کا شکار ہو گئی جس کی طرف اس کے باپ نے بڑے ہی جذباتی اور ڈرامائی انداز میں اس کی توجہ دلائی تھی اور پھر اس نے اسلام قبول کرنے کا اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

یہ عبرت ناک واقعہ میرے ایک دوست نے مجھے سنایا تھا۔ یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر کہی جا

سکتی ہے کہ انسان کا اچھایا برا عمل اپنے مثبت یا منفی اثرات رکھتا ہے۔ جہاں کسی مسلمان کے ایک اچھے عمل سے متاثر ہوکر کسی کی زندگی کی گاڑی صحیح راستے پر آسکتی ہے وہیں دوسری طرف کسی کے برے عمل کے اثر سے کوئی راہ حق پر آتے آتے اس سے برگشتہ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے نبیؐ کی حکیمانہ تعلیم یہ ہے کہ کسی برائی کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ جو مسلمان اپنا سامان فروخت کرتے وقت دکھاتے اچھا ہیں اور دیتے گھٹیا یا خراب ہیں، ان کے بارے میں اللہ کے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسے لوگوں سے نبیؐ کی بیزاری کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح کی بدعملی اور بدکرداری سے وہ کچھ وقتی فائدہ تو ضرور حاصل کر لیتے ہیں مگر دراصل وہ اسلام کو نقصان پہنچانے اور بندگان خدا کو دین حق سے باز رکھنے کے مجرم ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اللہ کے راستے سے روکنے والوں کے لیے بڑی وعید آئی ہے۔ لوگوں کو ان کے مال میں گھاٹا دینا، ڈنڈی مارنا اور دھوکہ اور فریب دینا وغیرہ غلط کاموں کو دنیا و آخرت میں خسارے کا سودا قرار دیا گیا ہے۔ کیا مسلمان قرآن وحدیث کی ان ہدایتوں پر توجہ کرے گا؟

(۲)

اس عبرت ناک واقعے کے برعکس ایک دوسرا واقعہ جو خود ہمارے مشاہدے میں آیا ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح ایک مسلمان کی ایمانداری اس بات پر منتج ہوئی کہ کئی لوگوں نے دین حق قبول کر کے اپنے رب کی ہدایت کا راستہ اپنالیا۔

یو پی ہی کے ایک شہر میں ایک ٹریفک انسپکٹر جنہیں لوگ بابو جی کہتے تھے سائیکلوں پر ٹوکن چیک کر رہے تھے۔ جن سائیکلوں پر ٹوکن نہیں تھے ان سے پیسے وصول کر کے ٹوکن دیئے جا رہے تھے اور اگر کوئی سائیکل والا پیسے جمع کرنے سے معذور تھا تو اس کی سائیکل ضبط کی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک داڑھی والے مسلمان (ملاّ جی) کی سائیکل کارندوں نے چیک کی۔ اس پر ٹوکن نہیں تھا۔ ان سے پیسے جمع کرانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے پیسے جمع کرانے سے معذرت ظاہر کی۔ اس پر کارندوں نے ان سے سائیکل جمع کرنے کے لیے کہا۔ ملاّ جی قریب ہی کرسی پر بیٹھے بابو جی کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کے پاس ٹوکن بنوانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ان کی سائیکل چھوڑ دی جائے۔ وہ چوڑیاں فروخت کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ جیسے ہی چوڑیاں فروخت ہوں گی وہ فوراً رقم ادا کر کے ٹوکن بنوالیں گے۔

بابو جی نے ملاّ جی سے کہا کہ جناب ہم نہ جانے کتنے لوگوں کو اس وعدے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ بعد میں آ کر ٹوکن بنوالیں گے مگر ہمارے مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ کوئی واپس آ کر ٹوکن نہیں بنواتا۔ ملاّ جی نے عرض کیا کہ جناب میں مسلمان ہوں، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ چوڑیاں فروخت ہوتے ہی آپ کے پاس آ کر ٹوکن بنوالوں گا۔ بابو جی نے ملا جی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور چھوڑ دیا۔ ملا جی شکریہ ادا کر کے اپنی سائیکل لے کر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ملا جی کی کچھ چوڑیاں فروخت ہوگئیں اور وہ

فوراً ٹوکن بنوانے کے لیے بابو جی کے پاس آ گئے اور ان سے ٹوکن بنوانے کی درخواست کی۔ بابو جی اعلیٰ ذات کے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ ملاّ جی تو بڑے سچے ثابت ہوئے اور حسب وعدہ پیسے ملتے ہی ٹوکن بنوانے آ گئے، جب کہ ان کے تجربے اور مشاہدے کے مطابق اس سے قبل جن لوگوں کو بھی چھوڑا گیا وہ وعدے کرنے کے باوجود واپس نہیں لوٹے۔ بابو جی کے مشاہدے میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی چھوٹنے کے بعد ٹوکن بنوانے کے لیے آیا تھا۔ انہیں اس بات سے مزید حیرت ہوئی کہ یہ کردار پیش کیا تو ایک مسلمان نے جس سے انہیں اس ایمانداری کی توقع نہ تھی۔

بابو جی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے۔ حالانکہ بات چند پیسوں کی تھی۔ مگر کردار کردار ہوتا ہے اس کے حصے بخرے نہیں ہوتے۔ انسپکٹر صاحب نے ملاّ جی کو بڑے ادب سے پاس رکھی کرسی پر بیٹھایا اور ان کا ٹوکن بنوا دیا۔ رسماً ان کی تعریف کے چند کلمات کہے اور ان کا نام و پتہ دریافت کیا۔

یہ ملاّ جی جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور بابو جی کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ بلکہ ان کو اپنے گھر جانے کے لیے انسپکٹر صاحب کے مکان کے سامنے سے ہی گزرنا پڑتا تھا۔

بابو جی اکثر اپنے گھر کے سامنے چارپائی یا کرسیاں ڈال کر بیٹھتے۔ ان کے دوست واحباب اور دیگر لوگ جو اپنے کسی کام سے بابو جی کے پاس آتے تھے، ان کی مجلس بھی جمتی۔ بابو جی کے گھر کے سامنے سے گزرتے وقت ملاّ جی کی نظر بابو جی پر پڑتی تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے۔ بابو جی ان کے سلام کا جواب دیتے۔ بابو جی چونکہ ملاّ جی کے کردار سے متاثر تھے اس لیے ان سے ایک طرح کی انسیت بھی ہو گئی تھی۔ کردار اپنا نقش لازماً چھوڑتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلا۔ ایک روز ملاّ جی حسب معمول بابو جی کے گھر کے سامنے سے ان کو سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے تو بابو جی نے ان سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ ملاّ جی مصافحہ کر کے پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بابو جی نے ان کی خیریت معلوم کی اور چائے وغیرہ سے ان کی تواضع کی۔ اب اس طرح کی مجلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر شروع ہو گیا دین حق اسلام پر گفتگو، اسلامی کتابیں پڑھنے پڑھانے اور سوال و جواب کا سلسلہ۔ اسلام کے بارے میں نہ صرف بابو جی اور ان کے اہل خانہ کی غلط فہمیاں دور ہونے لگیں بلکہ وہ اسلام سے متاثر بھی ہونے لگے۔ زندگی کی پہیلی حل ہونے لگی۔ دنیا میں آنے کا مقصد اور انسان کی حقیقی منزل آخرت کا تصور دل و دماغ میں راسخ ہونے لگا۔ قصہ مختصر یہ کہ ربِ کریم کے بھیجے ہوئے دینِ رحمت اسلام نے اپنا اثر اور کرشمہ دکھایا اور بات اس حد تک پہنچ گئی کہ بابو جی کے خاندان کے پندرہ افراد نے آگے پیچھے اسلام قبول کر کے اپنے رب کی صراطِ مستقیم کو پالیا۔ اس طرح ایک مسلمان کا اسلامی کردار متعدد افراد کی جہنم سے نجات اور حصول رضائے رب (جنت) کا ابتدائی ذریعہ بن گیا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج اور اسلام کی اشاعت میں دراصل اسلامی کردار ہی کارفرما رہا ہے۔ یہ وہ نسخۂ کیمیا ہے جو اپنا اثر ہر طرح کے دور اور ہر حالات میں دکھاتا رہے گا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے عزت و سربلندی کی آرزو رکھنا اور اشاعت دین حق کے خواب دیکھنا ہم مسلمانوں کی نادانی کے سوا کچھ نہیں۔ ابھی حال ہی میں ہم نے اسی کردار کا ایک شاندار کرشمہ دیکھا کہ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے والا اور ان کا ایک کٹر دشمن، جو مسلمانوں کی تباہی کے الزام میں جیل میں بند تھا، اس کے ساتھ ایک مسلم نوجوان قیدی کے حسن سلوک نے اس دشمن اسلام کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر اپنے جرم کو قبول کیا اور اس طرح مسلمانوں پر قیامت ڈھانے والا یہ شخص مسلمانوں کے لیے عافیت کا سبب بن گیا۔ میرا اشارہ سوامی اسیمانند اور کلیم کی طرف ہے۔ سوامی اسیمانند کو مالیگاؤں بم دھماکوں کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس حادثے میں متعدد مسلمان زخمی اور شہید ہو گئے تھے۔ کلیم کو بھی اسی الزام میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ کلیم نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ سوامی اسیمانند کی مذموم اور سنگدلانہ حرکت کی وجہ سے ہی اسے ناکردہ گناہ کی سزا دی گئی ہے، اس مسلم نوجوان نے اپنے دشمن اسیمانند کی خوب خدمت کی اور اس کے سامنے اسلامی کردار پیش کرتا رہا۔ اس کے حسن سلوک نے سوامی جی کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور سوامی جی نے اپنے ظالمانہ اور بہیمانہ جرم کو مبینہ طور پر قبول کر لیا اور برملا اس مسلم نوجوان کی ستائش بھی کی۔ مسلم نوجوان کلیم نے جو کردار پیش کیا وہ دراصل قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ اللہ نے قرآن مجید میں دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں مسلمانوں کو واضح طور پر یہ ہدایت دی ہے کہ تم برائی کا بدلہ حسن سلوک سے دو۔ اس کے نتیجے میں تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی اور عداوت تھی وہ تمہارا جگری دوست بن گیا ہے۔ (قرآن، ۴۱:۳۴) قرآن کی اس ہدایت کا اثر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جس دن مسلمان صحیح معنوں میں اسلامی کردار کے حامل بن جائیں گے اسی دن سے اس کے شاندار نتائج ان کے سامنے آنے لگیں گے اور اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ اپنے لیے عافیت وسلامتی و اخروی نجات کا سامان کریں گے بلکہ عام بندگان خدا کے لیے بھی سلامتی و ہدایت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ حفیظ میرٹھیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

تحریر سے ممکن ہے نہ تقریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

●●

ہمارے زمانے کا جامعہ

ظفر اثری فلاحی، لندن

*(گزشتہ شماروں میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۶۹ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک بھائی کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر**)*

میں میں نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک درسگاہ اسلامی چترپور چھوٹا ناگپور کمشنری میں (جو اس وقت جھارکھنڈ میں آتا ہے) پنجم تک ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد عربی اول میں داخلہ لے لیا۔ انیس الدین احمدؒ امیر حلقہ بہار کی کوششوں سے ۱۹۶۳ء میں وہاں عربی درجات کھل گئے تھے، اور اس کے بعد اس کا نام جامعہ کاشف العلوم رکھ دیا گیا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ اس کو تعلیم اور دعوت کا مرکز بنائیں گے۔ یہاں مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، مولانا محمود عالم اصلاحی، اور مولانا اقبال احمد اصلاحی تدریس کا اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے لئے جمع ہو گئے تھے، لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی ایک انتہائی کامیاب تجربہ کے باوجود یہ مبارک اور عظیم سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہاں میں نے عربی اول کی تعلیم حاصل کی، اور سالانہ چھٹی گزارنے گھر چلا گیا، جب چھٹیاں گزار کر اپنے ماموں محترم مولانا ابوالکلام عبدالمنانؒ کے ساتھ واپس چترپور گیا کہ عربی دوم میں داخلہ لوں تو مولانا شہباز اصلاحیؒ نے اطلاع دی کہ یہاں عربی درجات ختم کر دیئے گئے ہیں، اور تمام اساتذہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج تشریف لے گئے ہیں، انہوں نے ماموں محترم سے کہا کہ وہ مجھے بھی وہیں لے جائیں۔ ان کی ہدایت کے مطابق میرے ماموں محترم مجھے بلریا گنج لے گئے، اور وہاں مجھے مولانا جلیل احسن ندویؒ کے حوالہ کر دیا۔ یہاں میرا عربی دوم میں داخلہ

ہوا، اور ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۹ء تک میں یہاں زیر تعلیم رہا، اور فضیلت تک تعلیم مکمل کی۔ ہماری فراغت تک یہاں فضیلت کے بعد کسی قسم کا اختصاص کا شعبہ نہیں تھا۔ مولانا شہباز اصلاحیؒ بھی کچھ عرصہ کے بعد جامعۃ الفلاح تشریف لے آئے۔ فراغت کے بعد مولانا شہباز اصلاحیؒ نے مجھے اور خالد سیف اللہ (اردن) کو پوری حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا، ہم دونوں نے سبقاً سبقاً اس کتاب کو ختم کیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب نے مزید حدیث پڑھانے کا پروگرام بنایا۔

۱۹۶۲ء میں مکتب اسلامیہ کے (جس کا بعد میں جامعہ اسلامیہ نام رکھا گیا، اور پھر جامعۃ الفلاح ہوگیا) ابتدائی اول سے ہفتم تک کے درجات تھے۔ اور عربی کا پہلا کلاس چل رہا تھا جسے مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ شروع کر چکے تھے، آپ پورنیہ میں مدرس تھے وہاں سے آپ کچھ بچوں کو لے کر آ گئے، اور مدرسہ کی خدمت میں لگ گئے۔ انہیں نحو وصرف پڑھانے کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ جامعۃ کاشف العلوم کے بند ہوتے ہی بلریا گنج کے چند مخلص تحریکی کارکنوں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے عربی درسگاہ کے قیام کا منصوبہ بنالیا، اور مدرسہ کو توسیع دے کر مکمل عربی درجات کھولنے کا فیصلہ کر دیا، اور جامعہ کاشف العلوم سے فارغ ہونے والے تمام اساتذہ کو یہاں جمع کرنے میں بھی انہیں کامیابی حاصل ہوگئی۔ چنانچہ جامعۃ الفلاح کی داغ بیل ڈال دی گئی اور اور عربی اول سے عربی چہارم تک کی تعلیم شروع ہوگئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اعظم گڑھ شہر میں قائم عربی درسگاہ جامعۃ الرشاد کے کچھ طلبہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے ساتھ، جو وہاں مدرس تھے، جامعۃ الفلاح میں داخلہ کے لیے آ گئے۔ یہاں آ کر مولانا عبدالحسیب اصلاحی بچوں کی تعلیم وتربیت میں لگ گئے، اور اس کی ترقی کے لیے سرگرداں ہوگئے، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے دن ورات کو اس کے لیے تج دیتے ہوئے ایک نیا نصاب تعلیم اور پراسپکٹس تیار کیا۔ اس طرح یہ مدرسہ قدیم اور جدید کا سنگم بن گیا، اور مولانا جلیل احسن ندویؒ جامعۃ الفلاح کے پہلے صدر منتخب ہوئے، یہیں سے جامعہ کی ترقیوں اور بلندیوں کا آغاز ہوا۔ یہ بات بہت اہم اور قابل ذکر ہے کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ کو ملک گیر شہرت حاصل تھی، وہ مولانا مودودیؒ کے ساتھ پٹھان کوٹ میں کام کر چکے تھے، اور اس سے پہلے بریلی اور ثانوی درسگاہ رامپور میں تدریس کا فریضہ انجام دے چکے تھے، اور اسی طرح وہ یوپی میں جماعت کی امارت کی بھی ذمہ داریاں نباہ چکے تھے۔ مولانا مرحوم کی ان تمام حیثیتوں کے سبب جماعت اسلامی کے افراد اپنے بچوں کو دور دراز علاقوں سے بھیجنے کے لیے تیار ہوگئے۔ جامعہ بالکل نوزائیدہ تھا، اس کی پرورش وپرداخت ان کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا شہباز اصلاحیؒ بھی جامعہ کاشف العلوم سے جامعہ تشریف لے آئے، تو تعلیم وتربیت کا نظام اور بھی مستحکم ہوگیا۔

جامعہ کا آغاز ہوا تو نہ تو لائبریری تھی نہ کتب خانہ، نہ مطبخ نہ ڈائننگ ہال، بس ایک پختہ عمارت تھی (جو

اِس وقت سید مودودی منزل کے نام سے موسوم ہے) جس میں طلبہ رہتے تھے اور کلاسیں چلتی تھیں، اور اس کے ہال میں ہی پانچوں وقت کی نماز ہوتی تھی، غرضیکہ یہ عمارت تعلیم وتربیت کی آماجگاہ تھی۔ اور اس کے بائیں حصے میں مٹی کی عمارت تھی، جسے بنگلہ کہتے تھے، جو مطبخ کا کام دیتی تھی، اور وہیں طلبہ کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت اُن طلبہ کی تعداد ایک سو پچاس کے قریب تھی جو بورڈنگ میں رہتے تھے، اور پورے مدرسے میں کل ۵۰۰ر کے قریب طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور اسی بلڈنگ کے دائیں طرف پھوس کی عمارت تھی جس میں چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ایک لمبی کھپریل کی عمارت تھی جو مٹی کی بنی ہوئی تھی، اس میں ابتدائی اور ثانوی کے بچے زیر تعلیم تھے۔ موجودہ مسجد کی تعمیر کا بیشتر حصہ کھیت کی زمین پر ہے اور صحن کا آخری حصہ باؤلی کا حصہ ہے۔ حسن البنا منزل کا زیادہ حصہ کنواں اور اس سے لگ کر باؤلی کے اوپر ہے۔

جامعہ کا آغاز بے سروسامانی کے عالم میں ہوا تھا، بس ایک جوش اور جذبہ تھا، اور تحریک سے لگاؤ اور نصب العین سے عشق ومحبت تھا، اور اس عشق ومحبت کے ساتھ اساتذہ کی مخلص ٹیم تھی جس نے جامعہ کو بامِ عروج تک پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا، اور جو حالاتِ جامعہ کو اپنے دوش پر لے جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی، جیسے جیسے سال گزرتے گئے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور جامعہ کا شہرہ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلتا گیا، اور طلبہ جوق در جوق تعلیم کے لیے یہاں آنے لگے، اور یہ صورتحال پیدا ہوگئی کہ جامعہ تنگ دامانی کا شکار ہونے لگا۔ ایسی صورتحال میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے ۶۶۔۱۹۶۵ء میں بیرون ملک کا سفر کیا، اُن کے اِس سفر سے مسجد کی تعمیر اور طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر عمل میں آئی، اور اُن ہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ جامعہ کے روزمرہ بڑھتے ہوئے تقاضوں کی تکمیل بہ آسانی ہوتی چلی گئی۔

اس مدرسہ کا امتیاز نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس

ہمارے اساتذہ کرام علامہ حمید الدین فراہیؒ اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی تعلیمی اور تربیتی فکر کے حامل تھے، اور وہ براہ راست یا بالواسطہ ان کے افکار سے استفادہ کر چکے تھے۔ اس لئے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم پر اثر پڑنا فطری بات تھی، اور اس کے ساتھ ہی تربیت پر بھی اس کے دوررس اثرات تھے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہ ان کے افکار کی بنیاد ایسے اصولوں پر ہے جن سے ذہن کو بالیدگی ملتی ہے اور شخصیت کی بہترین نشوونما ہوتی ہے۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے قرآنی علوم اور اس کے بے شمار حقائق اور معارف کے ایسے دروازے کھولے ہیں جس کی مثال تاریخ اسلام میں کہیں نہیں ملتی، انہوں نے قرآن پر تدبر وتفکر کے اصول وضع کئے اور ساتھ ہی نظم قرآن کے اصول اور فلسفے کو متعارف کرایا، یقیناً ان علوم سے پوری امت صدیوں تک

استفادہ کرتی رہے گی۔ یہ قرآنی علوم کے باب میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کا تجدیدی کارنامہ ہے۔اسی طرح اسلامی علوم کی تجدید کا کارنامہ مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کے سر جاتا ہے،انہوں نے مسلمانوں کے فکری جمود کو توڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے،اور دین اسلام کی تشریح عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے اوران کے افکار کے نتیجے میں تعلیم وتربیت کے میدان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے۔ان دونوں مفکرین اور مصلحین کے افکار کے گہرے اثرات جامعہ کے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر موجود ہیں۔اسی لئے نصاب میں قرآنی علوم اور احادیث اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی شمولیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔اور حالات کے مطابق اس میں اول روز سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ان مفکرین کی فکری تحریک جمود کی تحریک نہیں تھی، بلکہ مستقل تبدیلی کی علامت تھی۔اسی لئے حالات اور زمانہ کے لحاظ سے جامعہ کے نصاب میں بھی تبدیلی ہوتی رہی،اور علم و فن کے دروازے کھلتے رہے۔

اس مدرسے کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ یہ مدرسہ کسی مسلک کی نمائندگی نہیں کرتا، یہاں کے اساتذہ کے اندر فقہی توسع ہوتا ہے۔دورانِ درس کسی خاص مسلک پر زور نہیں دیا جاتا،اساتذہ کرام بھی کسی مسلک پر اصرار نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ یہاں احناف اور اہل حدیث دونوں ہی مکتب فکر کے بچے زیر تعلیم ہیں۔اور کوئی بھی طالب علم اپنے مسلک پر عمل کرنے میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

اس کا سب سے اہم امتیاز یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم پر دوسرے مضامین کے مقابلہ میں زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔البتہ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ حدیث کو ایک فن کی حیثیت سے پڑھانے کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے، یہ نصاب تعلیم کی خامی ہے،حدیث کو ایک فن کی حیثیت سے پڑھانے کی اشد ضرورت ہے، اس لئے کہ قرآن کی تفسیر میں علوم حدیث کے بغیر کسی نتیجہ تک پہنچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

تدریس کا طریقہ عام مدارس سے ہٹ کر یہاں بالکل نئے انداز کا ہے، ہمارے زمانے میں طلبہ کو ہوم ورک کی مشق سے گزارا جاتا تھا،اور طلبہ کو اس بات کا پابند بنایا جاتا تھا کہ وہ خود سبق کو پڑھ کر آئیں اور اس کے مندرجات کو سمجھ کر آئیں اور اس کی خاطر لغات کی طرف رجوع کریں،اور ان کی مدد سے زیر مطالعہ سبق کے معانی اور مطالب کو سمجھ کر اور حل کر کے آئیں، کسی کو تفسیر اور کسی قسم کی تشریح دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔تعلیم کے اس طریقہ کو غلط سمجھا جاتا تھا کہ لیکچر کے ذریعہ کتاب پڑھائی جائے، بلکہ طلبہ کی اندرونی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے مطالعہ کرنے کی عادت ڈالی جاتی تھی اور اس کا پابند بنایا جاتا

تھا۔ یہ ضروری تھا کہ طلبہ اپنے اوقات کو منضبط کر کے ایسا ٹائم ٹیبل ترتیب دیں کہ دوسرے دن کے تمام اسباق تیار کر کے کلاسوں میں آئیں تا کہ طالب علم خود استاد کے سامنے سبق کا مطلب اور مفہوم بتلانے کی کوشش کرے۔ یہ ایک کامیاب تجربہ رہا ہے، اور یہ طلبہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ طلبہ کا اپنے طور پر اسباق کے معانی کو سمجھنا اور اس کے مطابق مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرنا، ہر وقت مفید رہا ہے، ہر چند کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں طلبہ کو اپنے اوپر ایک بوجھ تو ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن یہ ان کے اندر مطالعہ کی صلاحیت اور ذوق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

جامعہ کے ذمہ داروں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مدرسہ ترقی کے راستے پر گامزن ہو، چونکہ ابتدائی زمانہ ایسا تھا کہ اس وقت مدرسے کو آگے بڑھنے کے لئے ہر قسم کے تعاون کی ضرورت تھی، چنانچہ اس سلسلے میں ذمہ داروں نے ہر پہلو سے تعاون کیا۔ اسی طرح قصبہ کے لوگوں نے بھی باہر کے طلبہ کے ساتھ اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا۔

ڈاکٹر خلیل احمد نے اپنے دور نظامت میں مدرسے کی ترقی میں بہترین رول ادا کیا اور اس کے نظم و نسق کو اعلی سے اعلی معیار پر لے جانے کی کوشش کی، وہ نصاب تعلیم میں عصری علوم کی شمولیت کو ضروری سمجھتے تھے، مزید اس میں بنیادی تبدیلی کے بھی خواہاں تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ایک تجربہ کار معلم کو بلایا تھا، وہ تھے ماسٹر اکرام الدینؒ جو کہ سائنس کے ٹیچر تھے اور اسی طرح حکیم محمد ایوبؒ انتظامیہ کے ایک فعال ممبر تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ سے فارغ ہونے والے طلبہ داعی بن کر نکلیں اور اس کے لئے وہ اپنی حد تک برابر جدوجہد بھی کرتے رہے۔

دوران تعلیم اساتذہ میں ہم آہنگی اور طلبہ کی تربیت

تعلیم کے دوران کسی مرحلے میں اساتذہ کے درمیان ایسا اختلاف دیکھنے کو نہیں ملا جو مدرسے کے لئے نقصان دہ ہو، سب ہی اساتذہ مکمل یکجہتی کے ساتھ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں لگے رہتے تھے، اور ان کے درمیان آپس میں اتنا اتفاق تھا کہ جو کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ایک چھوٹی سی بستی میں ایک اسلامی معاشرہ کا نمونہ تھا، یہ ماحول اور یہ فضا طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے بہت ہی صحت مند تھی، یہ بات تقریباً عام تھی کہ قرآن و حدیث اور دوسرے مضامین سے متعلق کسی قسم کا سوال جو ایک استاذ کو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے وہ کسی دوسرے استاذ سے پوچھ کر حل کر سکتا تھا، اساتذہ کے درمیان کسی قسم کا حجاب نہیں ہوتا تھا، اسی طرح طلبہ کے اندر اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ وہ سیکھنے میں آزاد ہیں جس سے چاہیں اپنی تعلیم میں مدد حاصل کر لیں۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ اپنی تمام علمی و تصنیفی مصروفیات کے باوجود طلبہ کی تعلیمی کمزوریوں پر نگاہ

رکھتے تھے، اور درس کے علاوہ دیگر اوقات میں ان کی مدد کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔مولانا شہباز اصلاحیؒ کے یہاں طلبہ ہرفن کے بارے میں اپنے پیچدہ سے پیچدہ مسئلہ کو لے کر حاضر ہوجاتے تھے۔ وہ طلبہ کی بھرپور مدد کرتے تھے،ان کے یہاں وقت کی کوئی پابندی مانع نہیں ہوتی تھی۔ وہ طلبہ کے لئے ایک کھلی کتاب اور ایک صاف شفاف چشمہ تھے جس سے طلبہ ہروقت سیراب ہوتے تھے۔ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ کبھی طلبہ کی ہمت افزائی میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے اور مستقل طلبہ کے اوپر نظر رکھتے تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔ خارجی مطالعہ کی طرف وہ خصوصی توجہ دلاتے تھے۔ وہ بھی عربی بولتے اوطلبہ کے اندر بھی عربی بولنے کا شوق پیدا کرتے۔آپ نے آغاز کار میں جامعہ کے انتظامی امور کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔دارالمصنفین ،اعظم گڑھ سے عقیدت اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے وہاں کی کتابیں اور خاص طور سے علامہ شبلیؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتے تھے۔ وہ اردو زبان کے بارے میں بہت ہی حساس تھے،طلبہ کو دیہاتی زبان بولنے پرسختی سے منع کرتے تھے۔اسی طرح مولانا صغیراحسن اصلاحیؒ تربیتی امور پرنگاہ رکھتے تھےاور تربیت کے بارے میں وقتاً فوقتاً نصیحت کرتے رہتے تھے۔

تحریک اسلامی کے قائدین بھی جامعہ میں گاہے بگاہے تشریف لاتے رہتے تھے،طلبہ ان کے خیالات سے خوب مستفید ہوتے تھے،جن میں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ،مولانا صدرالدین اصلاحیؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں، اسی طرح دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مولانا شاہ معین الدین ندویؒ بھی جامعہ آتے رہتے تھے۔

اسی طرح دینی مدارس کے طریقہ تعلیم سے استفادہ کے لئے اس علاقہ کی مشہور درسگاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی جانے کا موقع ملا، ہمارے کلاس کے جملہ ساتھیوں نے جو آخری سال میں تھے وہاں جانے کا پروگرام بنایا،اور مولانا شبلی متکلمؒ کے حجۃ اللہ البالغۃ کے درس میں شریک ہوئے۔ یہ سب تعلیم وتربیت کے ایسے مواقع تھے جن سے مزید سیکھنے اور استفادہ کا سنہری موقع ملتا تھا،اور اس سے طلبہ ساتھیوں کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔

ہرجمعرات کو اردو اور عربی کے اجتماعات ہوتے تھے،طلبہ تیاری کے ساتھ ان دونوں زبانوں میں تقریریں کرتے تھے، اسی طرح تحریری مشق کی خاطر اردو اور عربی میں قلمی ماہنامے نکلتے تھے۔ یہ تمام باتیں مقاصد کے حصول میں معاون اور تربیت کے ذرائع میں شامل تھیں۔

ہمارے اساتذہ کرام میں مولانا جلیل احسن ندویؒ ،مولانا شہباز اصلاحیؒ ،مولانا عبدالحسیب اصلاحی،مولانا صغیراحسن اصلاحیؒ،مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی،مولانا عبدالعلیم اصلاحی،مولانا اقبال

احمد ندوی، ماسٹر مناظر احسنؒ، ماسٹر افضال احمدؒ، ماسٹر آفاق احمد قابل ذکر ہیں۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا عبد الحسیب اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور ماسٹر افضال احمدؒ سے درس کے علاوہ بھی استفادہ کا بھرپور موقع ملا اور انہوں نے تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے مواقع کی نہ صرف نشاندہی کی، بلکہ ہر مرحلے میں مفید مشورے دیتے رہے اور رہنمائی کرتے رہے۔

جامعہ میں صحت کی طرف توجہ

ہمارے مدارس میں اس کی بہت زیادہ کمی ہوتی ہے کہ صحت عامہ کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے، لیکن جامعہ میں عام مدارس سے ہٹ کر کچھ نہ کچھ توجہ ہمارے تعلیمی زمانے میں کھیل کود کی طرف بھی دی جاتی تھی، عصر کے بعد فٹ بال اور والی بال کھیلنے کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔ حالانکہ طلبہ کی صحت کی طرف توجہ دینے کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے، اس کے لیے مختلف کھیلوں کا انتظام اور اہتمام ہونا چاہئے۔

جامعہ کی صورت گری

۱۹۶۹ء کے جامعہ اور موجودہ جامعہ میں بہت فرق ہے۔ ظاہری طور پر جامعہ کی ترقی بہت ہوئی ہے اور اس کے نصاب کو پہلے سے بہتر بنایا گیا ہے، اندرون و بیرون ملک کی یونیورسٹیوں نے اس کی عالمیت اور فضیلت کی سندوں کو منظور کر کے اپنے یہاں داخلے کا دروازہ کھول دیا ہے، جس کے نتیجہ میں فارغین جامعہ کی علمی صلاحیت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جامعہ کی نیک نامی کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی فارغین جامعہ اہم اہم ذمہ داریوں میں لگے ہوئے ہیں، اور دعوت کے میدان میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ اسی طرح فارغین جامعہ جامعۃ الفلاح کے طرز پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس کے قیام میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں، غرضیکہ فارغین جامعہ دین اسلام کی اشاعت میں مختلف انداز سے لگے ہوئے ہیں۔ جامعہ کے قیام کا یہی مقصد تھا، جامعہ کے مادی اور معنوی وسائل میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا، رفتہ رفتہ اس کی ترقی میں اسی حیثیت سے اضافہ ہوتا گیا۔ ہاں، اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جامعہ کو کہاں تک پہنچنا چاہئے تھا، جہاں تک وہ اب تک نہیں پہنچ سکا ہے، اس کا صحیح جواب تو جامعہ کے ذمہ داران ہی دے سکتے ہیں۔ ہمارے خیال سے مجموعی طور پر جامعہ میں تعلیم و تربیت کے لئے پہلے سے بہت زیادہ وسائل مہیا ہو گئے ہیں، اسے بروئے کار لانے کے لئے اس کے تعلیمی معیار میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ ہی ایک علمی اور تحقیقی مجلّہ شروع کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے جو جامعہ کی تصویر کو اونچا کرنے میں بہترین کردار ادا کر سکے۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر.....

محمد اسماعیل فلاحی، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح بلریا گنج

وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ۔ إِذْ جَاء رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ (الصافات:۸۳۔۸۴)''بلا شبہ نوح کے ہم مسلکوں میں ابراہیم بھی تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس قلب سلیم لے کر آیا''۔

جب آپ کو کسی معالج سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا دل نازک (سیریس) حالت میں ہے، حجم بڑھ گیا ہے، نالیاں سکڑ گئی ہیں، خون کی سپلائی متأثر ہے، متعدد ہول (Valve) بلاک ہو چکے ہیں، اور کسی وقت بھی دل کی حرکت بند ہونے (ہارٹ اٹیک) کا خدشہ ہے۔ ایسے وقت میں آپ کا اور آپ کے عزیزوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ آپ پہلی فرصت میں امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرتے، اس کے مشوروں پر عمل کرتے، اس کی تجویز کردہ دوائیں پابندیٔ وقت کے ساتھ استعمال کرتے اور کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور نقل وحرکت کے سلسلہ میں جن جن باتوں سے اس نے روکا ہے، ان سے سختی سے پرہیز کرتے ہیں۔

اور ایسا کیوں نہ آپ کریں کہ دل ہے تو زندگی ہے، جب تک دل حرکت کر رہا ہے، آپ زندہ ہیں، جس لمحہ دل کی حرکت بند ہوئی، زندگی آپ سے رخصت ہوئی، اس کے بعد ہنستا، مسکراتا، کھیلتا انسان بے حس وحرکت اور بے جان لاشہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، دل دراصل قدرت کا سب سے انمول، سب سے خوبصورت اور سب سے پیارا تحفہ ہے، دل کی زندگی ہی انسان کی زندگی سے عبارت ہے، دل اچھا انسان اچھا، دل خراب انسان خراب، دل کی موت انسان کی موت، دل جتنا مضبوط صحتمند اور توانا ہوگا، اسی قدر انسان مضبوط اور صحتمند ہوگا، اگرچہ کہ وہ درہم ودینار اور دولت وحکومت اور اسباب ووسائل کے اعتبار سے کوڑی کا انسان ہو، لیکن اگر دل کمزور ہے تو درہم ودینار اور اسباب ووسائل سب کوڑی کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے، **ان الغنى غنى النفس** .''اصل تونگری تو دل کی تونگری ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ دل کی معمولی سی بیماری کی طرف بھی انسان سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر توجہ کرتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألا ان فى الجسد مضغة، اذا صلحت صلح الجسد كله، واذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهى القلب ۔''آگاہ رہو، جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب

وہ درست حالت میں ہوتا ہے تو پورا جسم درست رہتا ہے لیکن اگر وہ بگڑ جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے، جانتے ہو، وہ کیا ہے۔ وہ ٹکڑا انسان کا دل ہے''۔

مادی اور جسمانی اعتبار سے دل کی جو قدر و قیمت ہے، اس سے کہیں بڑھ کر اخلاقی اور روحانی اعتبار سے دل اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دل جس طرح جسمانی اعتبار سے بیمار ہوتا ہے، اسی طرح اس دل پر اخلاقی اور روحانی امراض کا حملہ ہوتا ہے، اور یہ حملہ زیادہ سخت اور زیادہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے، جسمانی اعتبار سے اگر دل بیمار ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک جان کا زیاں اور اس کے بال بچوں اور دوست واحباب کا اس سے فراق اور محرومی ہے، لیکن اگر دل کو جان لیوا اخلاقی و روحانی روگ لگ گیا تو نہ صرف ایک جان کا زیاں ہے، بلکہ ایسے شخص کی دنیا و آخرت دونوں برباد، اس کے ساتھ ساتھ اس کی اولاد، دوست احباب، رشتے ناطے، اور مرض کی سنگینی کے اعتبار سے زمین کے عام باشندے نسلاً بعد نسل متاثر ہوتے ہیں اور وہ زمین کے اوپر عملاً ایک بوجھ ہوتا ہے۔ وہ انسان کی شکل میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں لومڑی، بھیڑیا، یا کوئی اور درندہ ہوتا ہے، حقیقی انسان اس کے اندر سے کب کا نکل چکا ہوتا ہے۔ ایک عام انسان بھی ایسے شخص سے محبت رکھتا ہے جو صاف ستھرا اور خلوص و محبت سے بھرا، بےغرض دل رکھتا ہے، اگر چہ وہ ظاہری صورت کے لحاظ سے کتنا ہی بدشکل ہو، اس کے برعکس ایک انتہائی خوب رو اور خوب شکل آدمی اگر خودغرض اور گندے خیالات کا حامل ہو تو اس کے لیے کسی دل میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

اہل کتاب کے تذکرہ میں آتا ہے کہ جانتے بوجھتے جب انہوں نے مسلسل خدا کی نافرمانی کی، احکام خداوندی کی تعمیل میں خواہ مخواہ کی حجتیں کیں، حکم توڑا اور توڑتے رہے، تو اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ ان کے دل سخت کر دیئے گئے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاء وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّهِ وَمَا اللّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔ (البقرہ:۷۴) ''پھر اس کے بعد تمہارے دلوں میں سختی آئی اور وہ پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر، کیونکہ بعض پتھر تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ بہتی ہیں اور بعض شق ہوتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ خشیت الٰہی سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہاری حرکتوں سے بےخبر نہیں ہے''۔

چٹانوں سے چشموں، نہروں اور دریاؤں کا نکلنا ایک معروف بات ہے، لیکن اس تمثیل میں بنی اسرائیل کے لیے ایک تلمیح بھی پوشیدہ ہے، انہوں نے سینا کی صحرانوردی میں چٹان سے اکٹھے بارہ چشموں کا پھوٹ بہنا، اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، گئوسالہ پرستی کے بعد جب اجتماعی توبہ کے لیے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کے ستر نمائندے کوہ طور پر پہنچے تھے تو قدرت الٰہی کا جلال اس شکل میں ان کے سامنے آیا تھا

کہ ایک زبردست زلزلہ نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور پہاڑ گویا ان کے سروں پر آ گرا تھا، اسی طرح حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور پر پہنچے، اور دیدار الٰہی کی تمنا کی تو اللہ نے فرمایا کہ پہاڑ پر اپنی نگاہ جمائے رہو، اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا تو مجھے دیکھ سکتے ہو لیکن جب اللہ کی تجلی نمودار ہوئی تو پہاڑ مارے خوف کے اس کی تاب نہ لا سکا، اور وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا، یہ ان کی اپنی تاریخ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے نالائق جانشینوں سے فرمایا: تمہارے دل ان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔

دلوں کی یہ سختی نظر آنے والی چیز نہیں ہے، دل بظاہر دھڑکتا ہوگا، لیکن اندیشہ ہے کہ جانتے بوجھتے خدا کی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے اس میں سختی آ گئی ہو، اس کے بعد اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے، فویل للقاسیة قلوبھم من ذکراللہ، (سورہ الزمر) ''جن کے دل اللہ کی یاد سے سخت ہو گئے ہیں، ان کے لیے ہلاکت ہے''۔ اسی لیے اہل ایمان کو ہوشیار کیا گیا ہے: أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ۔ (الحدید:۱۶) ''کیا ایمان والوں کے لیے ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کے ذکر اور اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے اور ان لوگوں کی طرح وہ نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی (لیکن کتاب چھوڑ کر گناہوں میں لت پت ہو گئے اور اس حالت میں) ان پر ایک زمانہ گزر گیا اور (حالت یہاں تک پہنچی کہ آج) ان میں سے بہت سے لوگ کھلے فاسق ہیں''۔

پھر یہ بتایا گیا ہے کہ دلوں کی صحت کی علامت یہ ہے کہ کتاب الٰہی سے ان کے دل لرز جاتے ہیں، اور اس کے آگے وہ جھک پڑتے ہیں: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ۔ (الزمر:۲۳) ''اس کتاب الٰہی سے ان لوگوں کے رونگٹے کانپ اٹھتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر (یعنی کتاب اللہ پر عمل کرنے) کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں''۔ اسی طرح سورہ مریم میں ہے: إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَن خَرُّوا سُجَّداً وَبُكِيّاً۔ (مریم:۵۸) ''اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کا حال یہ تھا کہ رحمٰن کی آیتیں جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو بے اختیار سجدے میں روتے ہوئے گر پڑتے تھے'' اسی طرح ایک جگہ ہے: وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَعُمْيَاناً۔ (الفرقان:۷۳) ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعہ تذکیر کی جاتی ہے تو اس پر اندھے بہرے ہو کر نہیں رہ جاتے''، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ان پر آیات الٰہی کا اثر نہ ہو اور وہ ٹس سے مس نہ ہوں، بلکہ آیات الٰہی ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتیں اور انہیں حرکت وعمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ کفار کی طرح سنی ان سنی نہیں کرتے اور اعتراض کے لیے دل ودماغ پر تالا لگا کر ٹوٹ نہیں پڑتے۔

انسان کی سب سے بڑی مصیبت اس کے دل کی بصیرت اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت کا ختم ہوجانا ہے۔ وہ دیکھتا سب کچھ ہے لیکن اسے نظر کچھ بھی نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ کسی چیز سے اثر نہیں لیتا۔ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔ (الحج:۴۶)''واقعہ یہ ہے کہ آنکھیں جو سروں پر ہیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں''، یعنی انسان کی اصلی آفت دلوں کا اندھا پن ہے، دل اندھا ہے تو آنکھیں ہوتے ہوئے بھی وہ اندھا ہے، دل اگر بینا، صاحب بصیرت اور حساس ہے تو آنکھیں نہیں ہوتے ہوئے بھی وہ صحیح معنوں میں بینا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الصافات:۸۴)''(ابراہیم کی یہ بات قابل ذکر ہے) جبکہ وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے صاف ستھرا دل لے کر''، ابراہیمؑ کی سب سے بڑی خوبی ان کا صاف ستھرا، بھلا چنگا دل تھا، ان کے لیے قلب سلیم کا لفظ ان کی کامل حنیفیت، یکسوئی اور ان کے صدق واخلاص اور وفائے عہد کے کمال کی تعبیر ہے۔ یعنی وہ اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے ہیں جو شرک وکفر، کبر وحسد، نفاق وریا اور ہر طرح کی ضلالت وگمراہی کی ادنی سے ادنی آلائش سے بھی پاک تھا، عقیدے اور اخلاق کی تمام خرابیوں سے محفوظ دل، اللہ کی نافرمانی وسرکشی، برے میلانات، گندی خواہشات اور ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالکل صاف ستھرا دل، اللہ کے لیے محبت، اللہ کے لیے اخلاص، اللہ کا تقوی، اللہ کی خشیت، اللہ کے آگے خودسپردگی، اور کامل انقیاد واطاعت اور مکمل وفاداری کا مجسم پیکر دل، اور ظاہر ہے جو اللہ کا ہوگیا اس کا دل اب ہر ایک کے لیے خلوص ومحبت سے لبریز اور ہر طرح کی بدخواہی، خودغرضی اور نفسیات سے پاک ہوگا، ایسا ہی دل کل قیامت کے دن انسان کو نجات دلائے گا، يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ۔ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ (الشعراء:۸۸۔۸۹)''وہ دن یاد رکھے جانے کے قابل ہے جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ بیٹے، ہاں، وہ لوگ سرخ رو اور کامیاب ہوں گے جو خدا کے حضور بھلا چنگا، صاف ستھرا اور ہر طرح کی آلائش سے محفوظ دل لے کر حاضر ہوں گے''۔

ابراہیمؑ کی سب سے بڑی خوبی ان کا یہی دل تھا جسے قرآن نے قلب سلیم سے تعبیر کیا ہے، یہی دل ان کی تمام کامیابیوں کی کلید تھا، جس نے ان سے ایمان واسلام، انقیاد واطاعت، سرفروشی وجانبازی، ایثار وقربانی، وفائے عہد بندگی اور اللہ سے محبت کے وہ زندہ، روشن اور تابناک نقوش ثبت کرائے جو آج بھی دلوں کو گرماتے اور قربانی اور فداکاری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دل کیسے پیدا ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ کے ذکر اور اللہ کی کتاب سے جس قدر زندہ تعلق ہوگا، اسی حساب سے یہ دل بنتا چلا جائے گا، الا بذکر الله تطمئن القلوب ؛''اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے'' (اور اللہ کا سب سے بڑا ذکر اس کا کلام ہے)

آدمی دل بیدار رکھتا ہو اور اللہ کی کتاب کی طرف کان بھی لگائے اور متوجہ بھی ہو تب جا کر اس دل کو تذکر حاصل ہوتا ہے، اللہ کا تقوی پیدا ہوتا اور اس کی محبت جا گزیں ہوتی ہے: إِنَّ فِیُ ذَلِكَ لَذِكُرَی لِمَن كَانَ لَهُ قَلُبٌ أَوُ أَلُقَی السَّمُعَ وَهُوَ شَهِیُد۔ (سورۃ ق:۳۷)''اس میں یقیناً نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو دل بیدار رکھتے ہوں اور آگے بڑھ کر کان لگاتے ہوں اور متوجہ بھی ہوں''۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ذکر سے غفلت برتتے ہیں، اللہ تعالی ان پر شیطان مسلط کر دیتا ہے: وَمَن یَعُشُ عَن ذِكُرِ الرَّحُمنِ نُقَیِّضُ لَهُ شَیُطَاناً فَهُوَ لَهُ قَرِیُنٌ ۔ (الزخرف:۳۶)''جو رحمٰن کے ذکر سے اندھا بن جاتا ہے، ہم اس کے لیے ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے''۔ پھر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کی کیفیت گدھے کی ہو جاتی ہے، جن کی باگ شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ جس وادی میں چاہتا ہے ان کو لیے لیے پھرتا ہے: اسُتَحُوَذَ عَلَیُهِمُ الشَّیُطَانُ فَأَنسَاهُمُ ذِكُرَ اللَّهِ۔ (المجادلۃ:۱۹)''شیطان نے انہیں اپنے شکنجے میں کس لیا اور انہیں اللہ کے ذکر سے غافل کر دیا''، پھر اس کے بعد جب مسلسل اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے تو دلوں میں سختی اور قساوت آ جاتی ہے، جیسا کہ''ثُمَّ قَسَتُ قُلُوبُكُم مِّن بَعُدِ ذَلِكَ'' کے سیاق کلام سے واضح ہے، جب یہ حال ہو جاتا ہے تو انسان خدا کو فراموش کر دینے کے نتیجہ میں اپنی شناخت کھو دیتا ہے، اسی لیے فرمایا گیا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِیُنَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمُ أَنفُسَهُمُ أُوُلَئِكَ هُمُ الُفَاسِقُون (الحشر:۱۹)''تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھلا بیٹھے تو اللہ نے خود ان کو ان کی جانوں سے غافل کر دیا، یہی لوگ کھلے ہوئے فاسق ہیں''۔

واقعہ یہ ہے کہ جسے اپنی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، اسے اپنے رب کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے، کسی عارف کا قول ہے، من عرف نفسه فقد عرف ربه ''جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔ اپنی شناخت اور اپنے رب کی شناخت نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا آدمی نہ دین کے کام کا رہ جاتا ہے نہ دنیا کے کام کا۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اسے ہر چیز سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ جب بادل گرجتے ہیں تو اس کا سینہ بیٹھتا اور جب بجلی چمکتی ہے تو اس کا دل دھڑکتا ہے۔ جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، حوصلے ختم ہو جاتے ہیں اور پھر ایسے لوگ حق کے مقابلے میں جم نہیں سکتے، ان کی اسی کیفیت کی وجہ سے ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے: وَقَذَفَ فِیُ قُلُوبِهِمُ الرُّعُبَ یُخُرِبُونَ بُیُوتَهُم بِأَیُدِیُهِمُ وَأَیُدِیُ الُمُؤُمِنِیُن۔ (الحشر:۲)''اللہ نے ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی، وہ اجاڑ رہے تھے اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور مومنین کے ہاتھوں سے''، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے: لَهُمُ قُلُوبٌ لَّا یَفُقَهُونَ بِهَا وَلَهُمُ أَعُیُنٌ لَّا یُبُصِرُونَ بِهَا وَلَهُمُ آذَانٌ لَّا یَسُمَعُونَ بِهَا أُوُلَئِكَ كَالأَنُعَامِ بَلُ هُمُ أَضَلُّ أُوُلَئِكَ هُمُ الُغَافِلُون۔ (الاعراف:۱۷۹)''ان کے پاس ایسے دل نہیں جن

سے سمجھیں، ایسی آنکھیں نہیں جن سے دیکھیں، ایسے کان نہیں جن سے سنیں، یہ مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ، یہی پکے بے خبر اور غافل لوگ ہیں''۔ پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ توپ وتفنگ رکھتے ہوئے بھی وہ کچھ کرنہیں پاتے، اقبال نے اگرچہ کہا ہے کہ

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اور

کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لیکن تلوار اور یورپ کی مشینیں حقیقت میں مومن کے عزم کے آگے ان کا ساتھ بھی نہیں دیتیں، اس لیے کہ وہ ایمان سے لبریز قلب سلیم سے محروم ہوتے ہیں۔

کارکنان تحریک اسلامی اور ان کے قائدین کے لیے آج سب سے بڑی اور اہم ضرورت اسی دل کی تلاش اور اسی دل کی بازیافت ہے، اگر یہ دل پیدا ہوگیا تو اس راہ کی ہر منزل آسان ہوجائے گی، اور من احب لله وابغض لله واعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان ''جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے محروم کیا، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا'' کا نورانی منظر دنیا کے سامنے آجائے گا، اگر ایسا نہیں ہوسکا تو

شمع محفل ہوکے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

اور پھر

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس لیے تحریک اسلامی کے جوانوں کو سب سے زیادہ اسی قلب سلیم کی فکر کرنی چاہیے، ایسا قلب سلیم جس میں اللہ کے لیے محبت، اللہ کے لیے نفرت، اللہ کے لیے دینا اور اللہ کے لیے محروم کرنا، اللہ کے لیے نماز، اللہ کے لیے قربانی اور بالفاظ مختصر اللہ کے لیے جینے اور اللہ کے لیے مرنے کا جذبۂ بیتاب ہو۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

مدارس اسلامیہ

اور ہندوستانی زبانوں کی تدریس؟

- مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی محرک کیا ہے؟
- مدارس اسلامیہ کا اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں کیا کردار رہا ہے اور کیا کردار مطلوب ہے؟
- اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں سماج میں رائج زبانوں کی کیا اہمیت ہے؟ اور ان میں دسترس رکھنے والے افراد کی کس قدر ضرورت ہے؟
- مدارس اسلامیہ میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس کی موجودہ صورتحال کیا ہے
- اور ان زبانوں کو مدارس کے نصاب میں کس طرح اور کیا مقام ملنا چاہئے؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ’’مدارس اسلامیہ اور ہندوستانی زبانوں کی تدریس‘‘ سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

● **عبدالحق فلاحی**، ابوالفضل انکلیو،نئی دہلی۔موبائیل نمبر:
09899622150

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اسی فیصد آبادی قبول اسلام کی سعادت سے محروم ہے اور جہاں دعوت دین کے لیے بے شمار مواقع اور امکانات ہیں، آج دعوت دین ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ہدایت ربانی کو عام بندگان خدا تک پہنچانا ایک ناگزیر فریضہ ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب کی اصل زبان میں یہ پیغام پہنچایا جائے تا کہ اس کے سامنے دین کا پورا تصور واضح ہوجائے۔ یہ حکمت ومصلحت تمام رسولوں کی قوموں کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی اور دنیا کے جس خطے میں بھی کوئی رسول بھیجا گیا، جس قوم میں بھی کسی نبی کی بعثت ہوئی، اس قوم کی زبان میں نبی نے خطاب کیا، اور وہ پیغام اسی زبان میں نازل کیا گیا۔

یہی وہ بات ہے جسے قرآن بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے جو کہ دعوت دین کا ایک اہم نکتہ ہے۔﴿**وما أرسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم**﴾(ابراہیم:۴)

ہندوستان کا معاملہ دنیا کے دوسرے بڑے ملکوں سے یکسر مختلف ہے۔ چین کا کوئی باشندہ چینی زبان سیکھ لے تو اس کے لیے ایک زبان کافی ہے اور اس کے ذریعہ اس کی تمام علمی، فنی، تحقیقی، سماجی، سیاسی، مذہبی ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں، یہی معاملہ جاپانی، روسی، فرنچ، جرمن وغیرہ زبانوں کا بھی ہے۔ غیر اقوام سے تبادلہ خیال اور معاملہ داری کے لیے کوئی ایک انٹرنیشنل زبان انگریزی سیکھ لینا کافی ہے، مگر ہندوستان میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق کئی سو زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے اٹھارہ کو دستور ہند نے تسلیم کیا ہے۔ ۱۱۴/ دیگر زبانیں ہیں، ۲۱۶/ مادری زبانیں (Mother languages) ہیں، ۹۶/زبانوں کا اب تک باقاعدہ کوئی خاص نام اور شناخت نہیں ہے۔ دستور کی تسلیم شدہ زبانوں میں آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، منی پوری وغیرہ ہیں۔

ان علاقائی زبانوں میں کثیر الاشاعت اخبارات ورسائل نکلتے ہیں۔ صرف ملیالم زبان کے ایک اخبار روزنامہ ماڈھیمم کے ایک درجن سے زائد ایڈیشن ملک وبیرون ملک سے شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گروپ کے ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہنامہ رسالے الگ ہیں جو نوجوانوں، خواتین اور طالبات کے لیے مخصوص ہیں۔

مقصود کلام یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کی بڑی اہمیت ہے اور دعوت دین کے تعلق سے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے دینی مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے علاقے کی زبان کی تدریس اپنے نصاب ونظام تعلیم کا حصہ بنائیں اور اسے لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کریں تا کہ ان کے فارغین کو

مقامی زبان میں دعوت دین کا کام کرنے میں پریشانی نہ ہو۔

اس ضرورت کا احساس اب سے کم وبیش ستر سال قبل بانی تحریک اسلامی ہند مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے کیا تھا، چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں مدارس کے اجتماع میں فرمایا تھا:

......ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تقریر وتحریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ اور اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کردیا جائے۔ جنوبی ہند میں تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم اور مراٹھی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور ان ہی میں ملک کا لٹریچر شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر وتقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بے گانہ ہوکر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہم سایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔...............ہم اسلام کے مستقبل کو اردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اور ان سب کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں کی خاطر ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درسگاہوں سے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا اور اگر ان زبانوں میں انہیں کافی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے‘‘۔ (خطبہ مدارس، ۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء، صفحہ ۳۶-۳۷)

مولانا مودودیؒ نے اب سے ستر سال پہلے اپنی خداداد فراست اور بصیرت کی روشنی میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہورہے ہیں، اور جو رہنمائی کی تھی آج اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پہلے سے زیادہ معلوم ہورہی ہے۔

بات دینی مدارس میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس کی چل رہی ہے، یاد ش بخیر، شمال مشرق کے قبائلی علاقوں ناگالینڈ وغیرہ میں بعض ایسے عیسائی مشنریوں کی روداد مطالعے میں آئی ہیں جنھوں نے ان وحشی قبائلیوں کی بولیوں کو زبان کی حیثیت دی، اور اس کے لیے حروف اور زبان ایجاد کی، اس میں بائبل کا ترجمہ شائع کیا اور عیسائی مذہب کی دعوت وتبلیغ میں اپنی پوری زندگی کھپادی۔

دعوتی نقطہ نظر سے بعض صحابہ نے اپنی ہم سایہ اقوام کی زبان سیکھ کر اس میں مہارت پیدا کی، چنانچہ

حضرت زید بن ثابتؓ جو مدینہ میں کاتب وحی مقرر ہوئے اور قرآن مجید کو ضبط تحریر میں لائے، یہودیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خط وکتابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی نوشت وخواند سے انھوں نے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سریانی زبان سیکھی، اور صرف ۱۷ دن بلکہ اس سے بھی کم مدت میں سیکھ لی تھی۔ بقول مسعودی، وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے (دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۱۰، ص ۵۴۳-۵۴۴)

اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت زید بن ثابت نہ صرف عربی لکھ پڑھ لیتے تھے بلکہ انھوں نے آنحضورؐ کی ایماء پر عبرانی اور سریانی زبانیں بھی سیکھیں اور تھوڑے عرصہ میں ان زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی مشق بہم پہنچالی۔ بعد میں اس کو اور ترقی دی اور توریت وانجیل کے عالم بن گئے۔

علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف'' میں لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابت حبشی، قبطی، رومی اور فارسی زبانیں بھی جانتے تھے جن کو انھوں نے مدینہ میں ان زبانوں کے جاننے والوں سے سیکھا تھا''۔ (سرور کائنات کے پچاس صحابہ ص ۶۱۲)

مدارس اسلامیہ کے نصاب میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس کا کام صرف خانہ پری کے لیے نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے سنجیدگی بھی ہونی چاہیے، اور اس کی تعلیم وتدریس کے لیے ان زبانوں کے اہل اساتذہ (Qualified teachers) کی خدمات حاصل کرنی چاہیے۔ مدارس کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ سرکاری اسکولوں کے ریٹائرڈ ٹیچروں کی خدمات حاصل کریں جو کم معاوضہ پر بھی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا نہ بھولوں گا کہ سنسکرت زبان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے کیوں کہ اس زبان میں وید، شاستر کے علاوہ دیگر مذاہب کی اصل کتب موجود ہیں، ترجمہ سے استفادہ کر کے وہ بات نہیں بنتی جو اصل زبان میں مطالعہ کر کے ایک تحقیق پسند آدمی کو اطمینان اور شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس میں منطق وفلسفہ اور مناظرہ کے فن کو ترقی دینے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ اگر دعوت دین کے پیش نظر ملکی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر صرف کیا جائے تو وقت کے اہم چیلنجز کا ہم مقابلہ کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوسکیں گے۔

● **رضوان احمد فلاحی**، حال مقیم لندن۔ ای میل:
rizwanfalahi@hotmail.com

اس موضوع کے دو پہلو ہیں: اول: افادیت واہمیت، دوم: انطباق کی عملی شکل۔

جہاں تک اہمیت اور افادیت کا تعلق ہے وہ کسی بحث سے بالاتر ہے۔ اسلام کے پیغام کی

وضاحت جس طرح عربی سے نابلد اردو داں طبقے کے لیے ان کی زبان میں ضروری ہے اسی طرح غیراردوداں طبقات کے لیے ان کی اپنی اپنی زبانوں میں ضروری ہے۔اس کے لیے ناگزیر ہے کہ علاقائی زبانوں کے ماہرین تیار کیے جائیں جو براہ راست اسلام کے بنیادی ماخذ سے استفادے کی صلاحیت رکھتے ہوں اوران کے مطالب ومفاہیم کو مؤثر اور پیشہ ورانہ طریقے سے ان زبانوں میں منتقل کرسکیں۔علاقائی زبانوں کے ماہرین بلاشبہہ بہت ملیں گے لیکن وہ بنیادی ماخذ تک راست رسائی کی صلاحیت سے محروم ہوں گے،تو دوسری جانب براہ راست استفادے کی صلاحیت رکھنے والے ان زبانوں میں معیاری اسلوب میں اظہار بیان پر قادر نہ ہوں گے۔ایک پہلواور بھی قابل توجہ ہے،اور وہ ہے اہم اسلامی اصطلاحوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ۔اس پر وہی قادر ہوسکتا ہے جو ان زبانوں پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اصطلاحوں کو پوری گہرائی سے سمجھتا ہو اور حتی الامکان پوری ذمہ داری سے انہیں ان میں منتقلی کا ملکہ رکھتا ہو۔ایسے افراد اسی وقت دستیاب ہوسکتے ہیں جب مختلف علاقوں میں قائم اعلیٰ اسلامی تعلیم کے ادارے اس مقصد کے لیے اپنے یہاں علاقائی زبانوں کی معیاری تدریس کا اہتمام کریں اوران میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سہولتیں فراہم کریں۔

رہی یہ بات کہ اس کے انطباق کی عملی شکل کیا ہو،اس کا انحصار متعلقہ اداروں کو حاصل ان کے اپنے وسائل پر ہے۔اگر کوئی ادارہ تنہا یہ کام کرنے پر قادر نہ ہوتو ہم خیال اداروں کا گروپ قائم کرکے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اگر اہمیت وافادیت کا احساس قوی ہوتو کوئی نہ کوئی عملی شکل نکل ہی آئے گی، انگریزی محاورے کے مطابق کہ اگر ارادہ ہوتو راستہ نکل ہی آتا ہے (If there is a will there is a way)۔

● **پروفیسر محمد اسحاق**، اعزازی ڈائرکٹر ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔موبائیل نمبر: 09891922635

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے وجود اور بقا میں اہم ترین عامل تقلید وجمود کا عمومی ماحول ہے جو خواص وعوام میں عام طور پر عرصے سے دکھائی دیتا ہے۔زبان کی تدریس کا معاملہ بھی بڑی حد تک اسی ذہنی رویے سے وابستہ ہے۔اسی لیے مدارس کے حوالہ سے کسی قسم کی تبدیلی کی تجویز اس کے اپنے وجود کے لیے خطرہ کا مترادف قرار پاتی ہے۔ مذکورہ مسئلہ کے پس منظر میں یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ مقامی زبان کی اضافی تدریس سے قطع نظر اردو زبان کی تدریس زبان وادب کے پہلو سے بہت کم مدارس میں باقاعدہ نصاب کا حصہ ہے نیز مدارس کے تعلیمی معیار میں گراوٹ بھی بڑی تشویش کا باعث ہے۔

زبان کے حوالہ سے دینی مدارس میں پڑھایا جانے والا کلاسیکل نصاب عربی زبان میں ہے۔ان مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دینے والے افراد عربی اور اردو سے بالعموم واقف ہوتے ہیں لیکن دوسری زبانوں پر انہیں علمی مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک عام حقیقت ہے کہ کسی ایک زبان پر ہی اچھی قدرت اور صلاحیت علمی اور ادبی نقطہ نظر سے پیدا ہو پاتی ہے۔کئی زبانوں میں مہارت کی اکثر کوششیں اچھے نتائج نہیں پیدا کرتیں۔دعوتی نقطہ نظر سے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان پر اچھی قدرت ہو۔ الفاظ کا صحیح انتخاب اور جملوں کی صحیح ترکیب دعوتی پیغام کو مؤثر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

میرے خیال میں زبان کی تدریس ایک سنجیدہ موضوع ہے، اسے سطحی اور سرسری انداز سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ زبان ہی ہے جس نے حیوان کو حیوان ناطق بنایا، اس لیے اس کی اچھی اور اعلیٰ تعلیم سے ہی حیوان ناطق انسان بن پاتا ہے۔میری اس گفتگو کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ مقامی زبان کی مدارس میں تعلیم نہ دی جائے۔اس سلسلہ میں صحیح رویہ یہ ہوگا کہ اردو زبان کی معیاری تعلیم دی جائے اور ساتھ ہی مقامی زبان کی تعلیم کا بھی علیحدہ مناسب انتظام ہو، اور مقامی زبان بھی ہو جو علم کی زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہو۔ ہر زبان علم کی زبان نہیں ہوتی۔زبان کا ذاتی علمی و ادبی ذخیرہ اسے اوپر اور نیچے کرتا ہے۔

زبان کی تدریس اور ذریعۂ تعلیم کے لیے کسی زبان کے انتخاب کا فیصلہ جذباتی پہلو سے نہیں بلکہ عقل وشعور کے اعتبار سے ہونا چاہیے۔مدارس کے معیار کو بلند کرنے میں زبان کا یہ پہلو نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔کہا جاتا ہے کہ ''افریقہ کے نو آزاد ملک بارہ پندرہ سال کی مدت میں ترقی کے پہلے زینے پر آ کھڑے ہوئے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی پس ماندہ قبائلی بولیوں کو نہیں بلکہ انگریزی اور فرانسیسی کو اپنی مرضی سے ذریعہ تعلیم منتخب کیا''۔

غالب اور ترقی یافتہ قوموں کی زبان ہمیشہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں غالب رہتی ہے۔ جو حیثیت آج انگریزی زبان کی ہے وہی کسی زمانہ میں صدیوں عربی زبان کی رہی ہے۔مختلف قوموں کے لسانی اختلاط سے عربی زبان کی حفاظت کے لیے شروع میں حضرت عمرؓ نے عربوں کے عجمیوں سے اختلاط پر پابندی عائد کی یہاں تک کہ عربی زبان کا عمومی غلبہ ہو گیا۔اس تناظر میں بھی اس مسئلہ کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔

زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ مقامی اور پس ماندہ زبان کی تدریس مدارس کی سطح پر نصاب کا حصہ بنا کر نہ دی جائے بلکہ اس کی جگہ اگر دعوتی تنظیم کے زیر سرپرستی مدارس کے ان فارغین کو مقامی زبان کی تعلیم دی

جائے جنہیں اس مخصوص مقامی زبان میں دعوتی کام کرنا ہوتو زیادہ بہتر ہوگا۔اسی سے خالق کائنات کی اس ہدایت پر بہتر طریقہ سے عمل ممکن ہو پائے گا کہ ''اس راستہ کی طرف حکمت اور دردمندانہ تذکیر ونصیحت کے ساتھ بلاؤ''۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سریانی زبان صرف سترہ دن بلکہ اس سے بھی کم میں سیکھ لی تھی۔المسعودی کے مطابق وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے۔

زبان کا یہ پہلو بڑا اہم ہے۔وہ رابطہ کا کام کرتی ہے باہم لوگوں کو جوڑتی، ملاتی اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کا وسیلہ بنتی ہے۔سید سلیمان ندوی نے مقالات شبلی جلد ہشتم کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں مولانا شبلی نے جب کہ ہندوستان میں ارتداد کا طوفان برپا تھا، ندوہ میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا، اور بہت سے طالب علموں نے سنسکرت زبان سیکھ لی۔۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں ندوہ کے ایک طالب علم نے ہندی میں تقریر کرنی شروع کی تو لوگوں کو اس کے پنڈت ہونے کا شبہہ ہوا پھر جب اسی طالب علم سے قرآن کی تلاوت کی فرمائش کی گئی تو اس نے سورہ رحمان کی تلاوت اس خوش الحانی سے کی کہ سارا مجمع حیران اور تحسین کے کلمات کے ساتھ متأثر تھا۔

مدارس کے لیے آج ضروری ہے کہ وہ اپنے پیش نظر علم کی اپنی شاندار تاریخی روایت کو سامنے رکھے جس میں علم کارواں دریا زمان ومکاں کی اسیری سے آزاد ہوکر تیز گامی سے مختلف وادیوں کے حسن وجمال کو قبول کرتا ہوا اور اپنے رنگ وبو کو بکھیرتا ہوا راہ کی رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود آگے بڑھتا رہا اور اس نے دنیا کو عملاً یہ درس دیا کہ علم مومن کی گم شدہ میراث ہے۔مدارس اور اہل مدارس کو اسی گم شدہ میراث کو پانے کی کوشش کرنی ہے۔اس کے حاصل ہو جانے کے بعد علم کی پیاسی دنیا زبان کی رکاوٹ کو عبور کر کے اس چشمہ صافی سے سیراب ہونے کے لیے ہر طرف سے لپکتی ہوئی آئے گی۔

● **انیس احمد فلاحی مدنی**، صدر شعبۂ اعلی، جامعۃ الفلاح۔موبائیل نمبر:
08756901237

ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں پندرہ سے زائد اہم ترین زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں فریضۂ دعوت کی کما حقہ ادائیگی تمام مقامی زبانوں پر عبور حاصل کیے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ دعوت کے لیے داعی اور مدعو کے درمیان مشترک زبان کا پایا جانا ضروری ہے تا کہ داعی حق کے پیغام کو کھول کھول کر سمجھا سکے اور خدا کے کلام کی تبلیغ وضاحت کے ساتھ مقامی زبان میں کر سکے۔ارشاد خداوندی ہے:

﴿وما أرسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم﴾ (سورہ ابراہیم:۴) ''ہم نے ہر رسول کو اس کی اپنی زبان میں پیغام دے کر بھیجا تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔''

شہادت حق کی ادائیگی اور اپنے پڑوس میں رہنے والے ہم وطنوں کے کلچر، تاریخ وتہذیب اور رسوم ورواج سے واقفیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ اپنے اپنے نصاب میں وہاں کی مقامی زبانوں کو لازماً رکھیں۔ شمالی ہندوستان میں ہندی کو، گجرات میں گجراتی، جنوبی ہندوستان میں ملیالم، تیلگو اور کنڑ کو، بنگال میں بنگالی کو، عربی اردو کی طرح لازمی زبانوں کی حیثیت سے پڑھایا جائے کیونکہ اس کے بغیر اپنے پڑوس میں رہنے والے ہم وطنوں تک حق کو کھول کھول کر پہنچا دینا ممکن نہیں، نیز اس کی ضرورت واہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب آپ تمام ادیان ونظریات پر اسلامی فکر کے غلبہ کے خواہش مند ہوں اور باطل افکار ونظریات کی ریشہ دوانیوں سے اپنے سماج کو محفوظ رکھنا چاہتے ہوں۔

اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مقامی زبانوں کی تدریس واجب ہے آپ ؐ ہجرت کے بعد جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں یہودیوں سے سامنا ہوا جن کی مذہبی زبان عبرانی اور سریانی تھی چنانچہ آپ نے دعوت وتبلیغ کی ضرورت کے پیش نظر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، جس کی روایت امام بخاریؒ نے یوں کی ہے: ''عن زید بن ثابتؓ قال : قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم تحسن السریانیة؟ انها تاتینی کتب۔ قال: لا، قال: فتعلمها قال فتعلمتها فی سبعة عشر یوما۔ (زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ؐ نے مجھ سے پوچھا کہ تم سریانی زبان پر عبور رکھتے ہو، میرے پاس مختلف رسائل آتے ہیں، میں نے فرمایا نہیں، تو نبی اکرم ؐ نے فرمایا: اسے سیکھ لو، چنانچہ میں نے سترہ دنوں میں اسے سیکھ لیا۔)

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ؐ کی یہ شدید خواہش تھی کہ آپ کی امت ان تہذیبوں، ثقافتوں اور لغات سے واقف ہو جو اس کے معاشرے میں رائج ہیں، تاکہ انسانی تجربات سے استفادہ کیا جا سکے اور دعاۃ اپنے فریضہ کو آسانی سے ادا کر سکیں۔

آپ ؐ کی مذکورہ بالا ہدایت کی بنا پر متعدد صحابہ کرام نے مصر وروم میں رائج زبانوں قبطی، رومی، عبرانی اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

● **نعمان بدر فلاحی**، ہلدوانی۔ نینی تال۔ موبائیل نمبر:09760779872

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے قیام کے مختلف اسباب ومحرکات میں سے ایک اہم سبب دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے لیے مطلوبہ افراد کی تیاری بھی رہا ہے۔ ارباب مدارس گرچہ اپنی تاریخ کو

روشن گردانیں اور ملت کی مذہبی، معاشرتی اور سماجی ضروریات کی تکمیل کے لیے فارغین مدارس کی گراں قدر خدمات پر شادمانی کے ڈنکے بجائیں اور اس پر فخر کریں مگر حقیقت پسندانہ تجزیہ نا گفتہ بہ ہے۔

مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم ایک مختلف موضوع ہے جس پر بحث کا سلسلہ اہل علم و دانش کے درمیان مستقل جاری ہے مگر علاقائی اور ریجنل زبانوں کی ثانوی تعلیم کا معقول انتظام مدارس اسلامیہ میں نہ ہونا ایک المیہ معلوم ہوتا ہے۔ دعوت دین اور تبلیغ و اشاعت اسلام میں ''زبان و ادب'' کے کردار کا کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا شخص انکار نہیں کرسکتا۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں ایک درجن سے زیادہ بڑی زبانیں مثلاً ہندی، بنگلہ، آسامی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، تمل، کنڑ، تیلگو، ملیالم اور اڑیہ وغیرہ کروڑوں انسان بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں، وہاں مدارس اسلامیہ کے نظام میں بعض مقامات پر مقامی زبانوں کی محض ابتدائی تعلیم کا نظم ہماری نظر میں لمحۂ فکریہ ہے اور فریضۂ دعوت و تبلیغ دین کے تئیں ہماری سنجیدگی، فکرمندی اور حساسیت کا مظہر بھی۔

سروے یہ بتاتا ہے کہ بیشتر اسلامی مدارس میں عربی، اردو اور بنیادی انگریزی تعلیم کا ہی انتظام ہے۔ برطانوی عہد تک اردو بلا تفریق مذہب و ملت شمالی ہند کے عوام کی زبان تھی مگر تقسیم ملک کے بعد اب جبکہ عملاً صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے، فارغین مدارس نے اپنا دائرہ عمل مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقے تک محدود کرلیا ہے۔ مختلف ریاستوں میں مدارس اسلامیہ کا علاقائی زبانوں کے تعلق سے رویہ منفی اور عصبیت زدہ ہے۔

ملک کی شمال مشرقی ریاستوں میں میگھالیہ، میزورم، سکم اور اروناچل پردیش میں مسلمان برائے نام بستے ہیں، لہٰذا وہاں مدارس اسلامیہ اپنا وجود نہیں رکھتے۔ ناگالینڈ کے شہر دیما پور میں ایک مدرسہ ''دارالعلوم دیماپور'' ہے جہاں عربی چہارم تک تعلیم ہوتی ہے مگر وہاں مقامی ''ناگائیز'' زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

آسام کے شہر ''ہوجائی'' میں واقع ایک سماجی، فلاحی اور تعلیمی ادارے ''مرکز المعارف'' میں سکریٹری مولانا پرویز عالم کے مطابق ''آسام میں درس نظامی کے تحت ۱۵ر مدارس میں فضیلت اور ۲۵ر مدارس میں عالمیت تک تعلیم کا انتظام ہے، مگران خالص روایتی اسلامی مدارس میں ۳۰ر لاکھ آسامی زبان بولنے والے غیر مسلموں کی زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ آسامی زبان کی تدریس کا انتظام صرف مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے تحت چلنے والے نیم سرکاری مدرسوں میں ہے۔

جماعت اسلامی کے امیر حلقہ نورالاسلام مظہر بھوئیاں کے مطابق ''تماشہ تو یہ ہے کہ مدارس کا میڈیم اردو ہے اور طلبہ و اساتذہ کی اکثریت کو اردو سمجھ میں ہی نہیں آتی ہے''۔ براک ویلی (کریم گنج،

ہیلاکنڈی اور کچھار) میں رائج بنگلہ زبان کی تدریس کا بھی وہاں کے مدارس میں نظم نہیں ہے۔

گوہاٹی یونیورسٹی میں پروفیسر عبدالمنان کہتے ہیں ''آسام میں آباد ۲ رکروڑ ۱۶ رلاکھ غیر مسلم آبادی کی زبان کو پڑھنے اور پڑھانے کا رجحان آسام کے سیکڑوں اسلامی مدارس میں بالکل نہیں ہے''۔

ماہر تعلیم اور معروف اسلامی اسکالر پروفیسر عبدالقادر دَون کے مطابق آسام کے نیم خود مختار علاقے BTAD میں بوڈو نسل کے لوگوں کی تعداد ۲۲ رلاکھ ہے مگر ان کی ''بوڈو'' زبان کسی اسلامی مدرسے میں نہیں پڑھی جاتی، نہ ان کی زبان میں کوئی اسلامی لٹریچر موجود ہے۔ (اس وقت جب کہ فاشسٹ قوتوں نے بوڈو قوم کو مسلمانوں کا دشمن بنا دیا ہے ان کی زبان میں اسلامی لٹریچر دعوتی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کا حامل ہے)

گوہاٹی میں مقیم منی پور کے باشندے ماہر تعلیم حاجی صلاح الدین کہتے ہیں ''منی پور میں درس نظامی کے مطابق چلنے والے ۵ ر بڑے مدارس ہیں جہاں عالمیت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک مدرسے میں فضیلت تک تعلیم ہے مگر مقامی منی پوری زبان کی تعلیم و تدریس پر وہاں کوئی توجہ نہیں ہے''۔

ریاست تریپورہ کو ۳ ر جانب سے بنگلہ دیش نے گھیر رکھا ہے۔ ۹۰ ر فیصد آبادی غیر مسلم ہے۔ بنگلہ عمومی زبان ہے مگر ریاست کے ۵۰ مدارس میں کہیں بھی بنگلہ زبان کی تعلیم نہیں ہوتی ہے۔

معروف اسلامی اسکالر پروفیسر نجیب الرحمان بنگال کی صورت حال بیان کرتے ہیں ''بنگال میں درس نظامی کے تحت چلنے والے روایتی اسلامی مدرسوں میں پرائمری سطح پر درجہ پنجم تک بنگلہ زبان کی تدریس ہوتی ہے، البتہ مدرسہ بورڈ کے تحت چلنے والے نیم مدرسے جہاں حکومت کا نصاب چلتا ہے، ہائی اسکول تک بنگلہ زبان کی ایک مضمون کے طور پر تعلیم دی جاتی ہے''۔

ایک جائزے کے مطابق گجرات میں ۲۵ ر سے زیادہ ایسے اسلامی مدرسے ہیں جہاں عالمیت کی سند ملتی ہے مگر ایڈوکیٹ خالد شیخ کے مطابق ''میں کسی ایسے مدرسے کو نہیں جانتا جہاں گجراتی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہو''۔

تحریک اسلامی سے وابستہ نوجوان عالم دین مشتاق فلاحی نے بتایا کہ ''مہاراشٹر کے مدارس کا مراٹھی زبان سے رسمی تعلق بھی نہیں ہے۔ مراٹھی کو غیروں کی زبان اور اسی تعلیم کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے''۔

جنوبی ہند کی ریاست کیرلا کے بارے میں انسانی حقوق کے لیے سرگرم سماجی کارکن عبدالمجید ندوی بتاتے ہیں ''ہمارے یہاں بھی روایتی اسلامی مدرسوں میں ملیالم زبان کی بس ابتدائی درجوں میں تعلیم ہوتی ہے مگر یہاں فارغین مدارس یا علماء ملیالم سے واقف ہوتے ہیں اس لیے کہ تنہا وہی ایک زبان رائج ہے''۔

چنئی سے طالب علم لیڈر شہاب اختر نے بتایا کہ ''تمل ناڈو کے بعض بڑے مدارس نے تو تمل زبان

کوحرام سمجھ رکھا ہے''۔البتہ اب چند سالوں سے بعض جدید مدارس نے تمل زبان کی تدریس کو اپنے نظام میں شامل کیا ہے۔یہ ایک خوش آئند قدم ہے''۔

بنگلور میں سافٹ ویر انجینیر اور سوشل ورکر منیب خان کہتے ہیں''کرناٹک کے مدرسوں میں''کنڑ'' کی تعلیم وتدریس کا نظم میرے علم کے مطابق نہیں ہے''۔

بزرگ عالم دین مولانا عبدالعلیم اصلاحی کے مطابق''آندھرا پردیش کے اسلامی مدارس کو تیلگو زبان کی تعلیم کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے۔فارغین مدارس بالعموم ریاستی تیلگو زبان نہیں جانتے ہیں''۔

جماعت اسلامی اڑیسہ کے ذمہ دار محمود عالم صاحب کے مطابق''اڑیسہ کے مدرسوں میں اڑیہ زبان کی کوئی تعلیم نہیں ہوتی ہے۔فارغین مدارس ریاست کی سرکاری زبان اڑیہ سمجھتے تو ہیں مگر لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے ہیں''۔

ملک گیر سروے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ صرف بنگلہ اور ملیالم دو ایسی مقامی اور ریاستی زبانیں ہیں جن سے وہاں کے علماء نسبتاً بہتر انداز میں واقف ہیں۔بقیہ تمام علاقائی زبانوں سے مدارس کے طلبہ اور فارغین کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے مدرسے کا ہر طالب علم مقامی زبان کا ماہر نہیں ہوسکتا مگر زبان سے واقفیت (لکھنے،پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت) دعوت وتبلیغ کے نقطہ نظر سے لازمی ہے۔البتہ چند طلبہ مدارس کو علاقائی زبان وادب میں اختصاص پیدا کرنا چاہیے تاکہ علمی اور تصنیفی ضروریات بہتر انداز میں پوری ہوسکیں۔

● **ضمیر الحسن خاں فلاحی**، اسکالر ادارہ تحقیق وتصنیف،علی گڑھ۔ای میل:musabzamir@gmail.com

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے،لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس کے لئے ظاہری تدابیر اختیار نہ کی جائیں،اللہ تعالیٰ خود اس کی تدبیر فرماتا ہے اس طور پر کہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کر کے دین الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ بھی اسی تدبیر کا ایک مظہر ہیں،یہ دین کے قلعے ہیں جو ہمارے دین وایمان،ہماری تہذیب وثقافت اور اخلاق ومعاشرت کی حفاظت ونگہداشت کرتے ہیں،جہاں ہماری نسلیں اپنے مقصد زندگی سے آگاہ ہوتی ہیں اور جہاں صحیح خطوط پر ان کی علمی وعملی تربیت ہوتی ہے۔ان مدارس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ یہ فرد کے فکر ونظر کو درست کریں اور ملک وملت کی تعمیر میں نمایاں اور مثبت رول ادا کریں،

ہمیشہ سے ان مدارس کے قیام کا یہی نصب العین رہا ہے۔

کامیاب نصاب تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فرد کے شخصی ارتقاء، اس کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور زندگی کے جملہ انفرادی واجتماعی مراحل میں اس کی رہنمائی کرنے والا ہو۔ مدارس اسلامیہ کے موجودہ نصاب تعلیم میں انقلابات زمانہ واضح تبدیلی پیدا کر چکے ہیں، اور الحمدللہ اصلاحات اور تغیر وتبدیلی کی آوازیں بھی اٹھنے لگی ہیں، اس وقت ہمیں ایسے نصاب تعلیم کی ضرروت ہے جو فرد ومعاشرہ دونوں کی ضروریات وتقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

قرآن مجید چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس میں ایرانی وہندوستانی نبیوں کا تذکرہ تو نہیں ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ ''**ولکل قوم ھاد**'' ہر قوم کے لئے ایک ہادی اور رہنما ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ''**ومآارسلنا من رسول الابلسان قومه**'' ہم نے جس قوم میں بھی نبی بھیجا اس کا ہم زبان وہم قوم بھیجا۔

یہ بات بلاشبہہ بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں، خصوصا آزادی کے بعد، مدارس نے دین کے تحفظ کے لئے بڑا کام کیا ہے لیکن اس اعتراف میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر ارباب مدارس اپنے نصاب میں تقلید کی ریت کے بجائے اجتہاد اور غور وفکر کی روش پر چلتے تو وہ اس سے بڑی خدمت انجام دے سکتے تھے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی مسلم آبادی کے تہذیبی، لسانی اور تاریخی ورثہ اور مختلف سطح پر تنوع کے پیش نظر ایک جامع نصاب کی اشد ضرورت ہے۔ وطن عزیز میں طریقہ تعلیم ونصاب تعلیم کے جو ارتقائی منازل ہیں ان میں انتہائی اہم دور وہ ہے جو ملا نظام الدین سے شروع ہوتا ہے اور جسے ان کے نام سے موسوم کرتے ہوئے درس نظامی کہا جاتا ہے، اپنے زمانے کے اعتبار سے یہ ایک انقلابی اقدام تھا، اس میں ریاضی، الجبرا، علم نجوم وغیرہ جیسے سائنسی علوم شامل تھے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ گذشتہ تقریبا تین صدیوں سے وہی درس نظامی بغیر کسی تبدیلی کے عمومی طور سے ہمارے یہاں رائج ہے جو بحیثیت مجموعی قابل ترک ہو چکا ہے۔ بقول مولانا شبلی نعمانی نہ تو جدید انگریزی تعلیم اور نہ ہی ہمارے مدارس کا قدیم روایتی نصاب تعلیم ہماری ضروریات ومقتضیات کے مطابق ہے، ہماری ضروریات کی تکمیل کے لئے دونوں نصاب ہائے تعلیم میں بہترین امتزاج کی ضرورت ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ علوم وفنون کی دنیا میں ترقی ہورہی ہے مگر مسلمان ان علوم وفنون کی طرف صرف اس لئے مائل نہیں ہیں کہ یہ غیروں کے علوم اور غیروں کے فنون ہیں، حالانکہ اسلام کے پاس جس قدر لٹریچر موجود ہے، وہ تمام دنیا کے علوم وفنون کا مجموعہ ہے اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جس کے علم کو کمال بے تعصبی سے مسلمانوں نے حاصل نہ کیا ہو، ابوریحان البیرونی نے چودہ برس اسی ہندوستان میں بیٹھ کر سنسکرت

پڑھی اور ہندوستان کے حالات پر ایک کتاب ''تاریخ الہند'' لکھی جو خود ہندوستانیوں کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتی ہے اور جن کے بارے میں غیروں کا خیال ہے کہ سنسکرت کا اس سے بڑا عالم نہیں گزرا۔

یہ امر بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں رہتے ہیں، ہمارا یہاں کے باشندوں سے ہر وقت کا ساتھ ہے۔ اس حیثیت سے اللہ کے پیغام کو ان تک پہنچانا ہمارا دینی واخلاقی فریضہ ہے، اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہم اس بات کے شدید محتاج ہیں کہ اپنے نصاب میں یہاں کی اکثریت کی زبانوں کو داخل کریں اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم ان تک اللہ کا پیغام پہنچا سکیں یا اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو فرمایا کہ: ہم نے رسولوں کو قوموں کی زبانوں میں مبعوث کیا، اس کی حکمت یہی ہے کہ مدعو قوم کی زبان سے واقفیت بلکہ اس میں مہارت کے بغیر دعوت الی اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نبی پاکؐ کی حیات مبارکہ میں ایسے نقوش موجود ہیں جن سے اس امر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا سریانی زبان جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اسے سیکھ لو، چنانچہ میں نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی۔

دوسری روایت میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت زید کو سریانی کے علاوہ فارسی، حبشی، عبرانی اور یونانی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ (**العقد الفرید**) محمد بن کعب القرظی سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا! تیری مخلوقات میں سب سے زیادہ صاحب علم کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو اپنے علم کے ساتھ دوسروں کا علم بھی حاصل کرے۔ (**الوابل الصیب من الکلم الطیب لابن القیم**)

مذکورہ بالا دونوں روایتوں کا صریح مفہوم ہے کہ ہمارے مدارس میں ملک کی زبانوں کا رواج وقت کی شدید ضرورت اور حالات کا عین تقاضا ہے اور اس ضرورت وتقاضے سے غفلت ولاپروائی کا مطلب اپنے نصب العین سے غفلت برتنا ہے۔ جس طرح ابتدائے اسلام سے آج تک ہر زمانہ کے موافق مذہبی تعلیم کا نصاب بدلتا آیا ہے، آج بھی ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم موجودہ زمانے کی ضروریات کے موافق بنایا جائے اور یہی چیز ہے جس کے نہ ہونے کے نتیجہ میں آج ہندوستان میں ہزاروں مدارس ہونے کے باوجود قوم کی مذہبی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔

قوم کو مذہبی طور پر ضرورت ہے:

۱۔ معاصر فلسفہ سے دین اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، ان کا اطمینان بخش جواب دیا جائے۔

۲۔ ہندو مذہب کی بنیادی کتابوں کی روشنی میں انہیں ایک خدا کی طرف بلایا جائے۔

۳۔ نبی پاک صلی علیہ وسلم اور عالم اسلامی کی صحیح ومفصل تاریخ سے واقفیت حاصل کر کے ان سے ان کے لب ولہجہ میں گفتگو کی جائے۔

۴۔ ویدوں، اپنشدوں، گیتا ورامائن کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے وغیرہ، یہ کام رائج الوقت نصاب تعلیم سے انجام نہیں پا سکتا۔

اس کے لئے ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ملکی زبانوں کی تدریس کے ضمن میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض زبانیں تو وہ ہیں جنہیں عالمگیریت حاصل ہے مثال کے طور پر انگریزی، فرنچ وغیرہ، اس وقت انگریزی زبانوں میں جس قدر سرمایہ جمع ہے اور ہو رہا ہے اس لحاظ سے لگتا ہے کہ اس سے کامل واقفیت ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

ہندی زبان ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے، یہاں کی اکثریت اسی سے مانوس ہے۔اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس اہم زبان کو شامل نصاب کئے بغیر ہمارے مدارس حفاظت دین کا کام کر سکیں اور دین کا قلعہ ثابت ہو سکیں۔اسی طرح پالی، ملیالی، بنگلہ، تلگو، مراٹھی و دیگر علاقائی زبانوں کی تدریس بھی وقت کا شدید ترین تقاضا ہے۔

ملک کی زبانوں سے عدم واقفیت اور اس سے بڑھ کر اس محرومی پر حیرت انگیز اطمینان کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ ہند کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں، اور آئندہ برداشت کرنا پڑ سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہر وہ شخص با آسانی لگا سکتا ہے جو اس ملک میں بحیثیت مسلمان رہتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس وقت کی ضرورت، حالات کا تقاضا اور فطرت کی پکار ہے، اس کے بغیر مدارس سماج میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کے لائق نہیں ہو سکیں گے۔

● **فیضان شاھد فلاحی**، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔موبائیل نمبر:09868369258

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق جہاں شعور کا ہے وہی نطق بھی ایک اہم درجہ رکھتا ہے، ان ہی دو صلاحیتوں کی بنیاد پر انسان اشرف المخلوقات کا درجہ پاتا ہے۔نطق کی ان ہی صفات سے اللہ نے نبیوں، پیغمبروں، اور صالحین کو نوازا، اور اگر کسی میں اس صلاحیت کی کمی کا احساس ہوا تو اس نے خدا تعالیٰ سے دعائیں کیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کی عقد زبان کو کھولنے اور ہارون کو اپنا ترجمان بنائے جانے کی دعا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے صحابی کو دینی فہم وبصیرت پیدا ہو جانے کے بعد سریانی زبان سیکھنے کی اجازت دی۔اس طرح زبان کی اہمیت نہ صرف مذاہب نے محسوس کی بلکہ حکومتوں نے بھی اس کی نزاکت کو محسوس کیا ہے۔بدھ مذہب کے تیزی سے پھیلنے کے اسباب میں ایک بڑی وجہ عوامی زبان میں اس کی تبلیغ ہے،

اور ہندومت کے پیچیدگیوں میں الجھنے کی ایک بڑی وجہ اس کی زبان کا ایک خاص طبقے تک محدود ہونا ہے۔

مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے بھی زبانیں اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے پاس ان کو سیکھنے کے لیے واضح مقصد بھی ہے، اور وہ یہ کہ وہ پیغام ربانی کی صحیح ترسیل کرسکیں اور ان علاقوں تک اسلام کے پیغام کو پہنچا سکیں جہاں اسلام اپنی صحیح شکل میں نہیں پہنچ سکا ہے۔ ہندوستانی تناظر میں یہ بات اور سنجیدہ و قابل غور ہے، کیونکہ ماہرین لسانیات نے ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا ہے۔ گریرسن کا خیال ہے کہ یہاں ۱۷۹ر زبانیں اور ۵۴۴ر بولیاں پائی جاتی ہیں۔ جب مدارس اسلامیہ میں زبانوں کی تدریس کی بات ہو تو ایسی زبانوں کو منتخب کرنا ہوگا جو ملک کی ثقافتی ترقی میں مؤثر ہونے کے ساتھ ساتھ دعوتی نقطہ نظر سے بھی ایک کثیر طبقے کے لیے معاون اور مفید ہوں۔

مدارس اسلامیہ میں تدریس کی جو صورتحال ہے وہ کسی سے چھپی نہیں ہے، تدریسی مقاصد کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ پورا نصاب کتابوں تک محدود ہے، پورا نظام تعلیم ایک خاص نہج پر چل رہا ہے۔ بیرونی علوم کے دروازے بند ہیں۔ کتابوں کا مقام شرحوں اور تلخیص نے لے لیا ہے۔ مخصوص عقائد و نظریات سے اختلاف رکھنے والے رسائل و کتابیں ممنوع ہیں۔ البتہ زبانوں کی تدریس ایک ایسا مسئلہ ہے جو مسلک و منہج سے بالاتر ہے۔

زبانیں بلاشبہ اپنے بولنے والوں کی طرح سماجی محرکات وعوامل کی پابند ہوتی ہیں اس کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے ربط وضبط رکھیں، مگر تدریس میں عام زبانوں پر ایک ہی طریقہ نافذ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی نے اپنے مقالے دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری چیلنجز میں لکھا ہے کہ: ''.......عربی زبان کی تعلیم میں جو روایتی طرز تعلیم اختیار کیا جاتا ہے اور جن سے طالب علم کو اپنے قیام کا ایک بڑا حصہ محض عربی سیکھنے پر صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جگہ جدید اور تیز رفتار طریقے اختیار کیے جائیں۔''

زبانوں کی تدریس کے طریقہ میں تبدیلی لانا ہوگا اور اس کی تدریس سے نہ صرف مختلف زبانوں میں موجود ادب، روایات، اقدار اور علوم سے دوسرے لوگ واقف ہو سکیں گے بلکہ دوسری زبانوں کا سرمایہ ایک دوسرے میں منتقل ہو کر ان کے علمی سرمائے میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرے گا۔ یہ ادبی اور علمی سرمایے مدارس کے طلبہ کے لیے دینی و فکری مواد کے ساتھ ساتھ دعوتی ماحول و مواقع بھی فراہم کریں گے۔

مدارس ہندوستان کے جن خطوں میں ہوں ان میں اردو زبان کے علاوہ علاقائی زبان کی بھی تدریس ہو۔ مثلاً پنجاب کے مدارس پنجابی، گجرات کے گجراتی، مہاراشٹر کے مراٹھی وغیرہ، اس سے نہ صرف دعوت دین کے مبلغ، مترجم اور خطیب حاصل ہوں گے بلکہ دعوتی امور میں آسانیاں بھی حاصل ہوں گی۔

برطانیہ کو جب ہندوستان پر حکومت کرنا ہوا تو انھوں نے یہاں کی زبانوں پر نہ صرف خاص توجہ دی، بلکہ باقاعدہ اس کے لیے شعبے قائم کیے،فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔عہد سلطنت میں حوض خاص (دہلی) ایک ایسا مدرسہ تھا جہاں بغداد کے collaps کے بعد علماء کی ایک بڑی تعداد آئی،اورانھوں نے دینی بصیرت اور علاقائی زبانوں میں اتنی مہارت پیدا کی کہ مورخین لکھتے ہیں کہ ایک وقت تھا کہ جب بغداد میں دینی مسئلہ حل نہ ہوتا تھا تو ہندوستان کے علماء کو خط لکھا جاتا تھا۔

مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کو اس نکتہ پر خصوصا غور کرنا چاہیے۔ ہر مدرسہ میں اگر ممکن نہ ہو تو تمام مدارس کو مل کر ضلعی یا علاقائی سطح پر لنگویج سیل (Language cell) قائم کرنا چاہیے۔

ہندوستانی زبانوں کو انتخابی مضمون کے طور پر رکھا جائے اوران زبانوں سے دلچسپی ظاہر کرنے والے طلبہ کو اسے منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے۔صرف زبانوں کی تدریس پر توجہ نہ دی جائے بلکہ ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس سے اچھے شعراء،ادباء،مبلغین ومترجمین پیدا ہوسکیں۔جدید آلات کے اس دور میں زبان فہمی کے جتنے وسائل ہیں ان کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ مدارس کے فارغین سب سے زیادہ ہندوستانی زبانوں کے عالم ہوتے ہیں۔ان کو بیک وقت ہندی،اردو،انگریزی ،عربی کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں کا بھی علم ہوتا ہے اس طرح کا قدم ان کی صلاحیتوں میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا۔اس طرح زبانوں کی تدریس کی وجہ سے مدارس نہ صرف دین کی اشاعت میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں بلکہ زبانوں کے فروغ میں بھی بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

● **ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی**، استاذ جامعۃ الفلاح،بلریا گنج۔
ای میل: zakighazi786@gmail.com

انفرادی نقطۂ نظر سے تعلیم کا کام فرد کی تمام قوتوں کو پوری ترقی دینا ہے۔لیکن بغیر سماج کے،فرد کا کوئی وجود نہیں ہوتا کہ افراد ہی سے سماج تعمیر پاتا ہے۔جب سماج اور فرد ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تو ہمارے اداروں کی تعلیم کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ ان کے ذریعے فرد کو اپنے نشو ونما کے پورے مواقع بھی حاصل رہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھا شہری بن کر سماج کی بہبودی کے لیے بھی اچھے کام کر سکے۔ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے،جس میں ہر شہری کو ملک کی ترقی میں حصہ لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے،لہٰذا اس ملک میں تعلیم کے مقاصد درج ذیل خطوط پر ہونے چاہئیں: جسمانی نشو ونما (فزیکل ڈیولپمینٹ)،ذہنی نشو ونما (مینٹل ڈیولپمنٹ)،کرداری نشو ونما (کیریکٹر ڈیولپمنٹ)،شخصیت کی نشو ونما (پرسنالٹی ڈیولپمنٹ)،سماجی نشو ونما (سوشل ڈیولپمنٹ)،روحانی نشو ونما (اسپریچول ڈیولپمنٹ)،ثقافتی

نشو ونما (کلچرل ڈیولپمنٹ)،سماجی برائیوں کا خاتمہ (ابولیشن آف سوشل ایولس)،سائنسی مزاج کا ارتقاء (سائنٹفک اٹیٹیوڈ ڈیولپمنٹ)،قومی حس کا نشو ونما (نیشنل فیلنگ ڈیولپمنٹ) اور بین الاقوامی جذبے کا فروغ (انٹرنیشنل فیلنگ ڈیولپمنٹ)۔

یہ وہ نمایاں مقاصد ہیں جو ہندوستان جیسے کسی بھی جمہوری اور تکثیری سماج والے ملک میں تعلیم وتربیت کے اداروں کا محلِ توجہ واہتمام بننے چاہئیں۔ یہاں ان تمام مقاصد کی نہ تشریح کی جاسکتی ہے اور نہ ہی عنوانِ مذاکرہ اس کا متقاضی ہے۔ دراصل اسے حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق کہیے، ہندوستانی مدارس کے طلبہ کو خواہی نہ خواہی کئی محاذوں کے لیے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ انہیں خالص دینی علوم کے علاوہ عربی زبان وادب اس لیے سیکھنا ہوتی ہے کیونکہ یہی ان کے دین کی زبان ہے اور سارا اسلامی علمی سرمایہ سلف سے خلف تک اسی میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ انہیں اردو زبان اس لیے سیکھنا ہوتی ہے کہ یہ ان کی مادری (مادرِ حقیقی یا مادرِ علمی یعنی مدارس) زبان ہے اور برِصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں میں اصلاح وتبلیغ کا کام اسی کے میڈیم سے انجام پاسکتا ہے۔ انہیں انگلش زبان اس لیے سیکھنا ہوتی ہے کیونکہ بہر حال یہ ایک عالمی زبان ہے، اسلام کے تئیں موافق ومخالف لٹریچر عصر حاضر میں جس پیمانے پر اس زبان میں تیار ہوا ہے اس کی نظیر ملنا محال ہے۔ اس کو سیکھنے میں کسی حد تک احساسِ کہتری مٹانے اور خود کو ماڈرن دکھانے کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے۔ طلبۂ مدارس کو ہندی زبان اس لیے سیکھنا پڑتی ہے کیونکہ یہ ان کے ملک کی قومی زبان ہے۔ سارا ملکی نظام اسی پر چل رہا ہے، اکثریتی طبقہ جو اسلام کی دعوت وتبلیغ کا اصلی مستحق ہے، ان کے یہاں اسی زبان کے ذریعے بار پایا جاسکتا ہے۔ اس پر مستزاد وہ علاقائی زبانیں ہیں جو ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کے مختلف علاقوں میں متداول ومستعمل ہیں اور جن کا الگ لٹریچر اور الگ گرامر وادب ہوتا ہے۔ اپنے اپنے علاقوں میں کام کرنے کے لیے ان علاقائی زبانوں کا ماہر ہونا بھی از بس ناگزیر ہے۔ یہ ہندوستان کے دینی مدارس کے طلبہ کا وہ ناگزیر وناگریز فرضِ عین ہے جو زمانے اور حالات نے ان پر تھوپ دیا ہے۔ زیادہ تلاش وجستجو کریں تو شاید بعض مدارس کے طلبہ ایسے بھی مل جائیں جو ابھی تک فارسی زبان وادب کو گلے سے لگائے ہوں اور اس میں کمال حاصل کرنے میں اپنی صلاحیتیں اکارت کر رہے ہوں۔ چونکہ دینی مدارس کے طلبہ میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کا قابلِ ستائش جذبہ پایا جاتا ہے، اس لیے ان مدارس کے طلبہ کی ایک قلیل تعداد ایسی بھی مل جائے گی جنہوں نے سنسکرت زبان میں درک حاصل کیا ہے تاکہ اسلام کی دعوت وپیغام کو خود غیر مسلموں کے مذہبی صحیفوں سے مدلل کر کے پیش کرسکیں۔

اس ڈھیر سارے بوجھ کے تلے عموماً طلبۂ مدارس کی صلاحیتیں اور امنگیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اس پر امت کی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ بچوں کو اور بالخصوص اچھی ذہانت رکھنے والے بچوں کو مدارس کی تعلیم سے

دور رکھا جاتا ہے۔ایسے میں ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں عاجزانہ مشورہ یہ ہے کہ زبانوں کی تدریس کے سلسلے میں وہ اپنے طلبہ پر رحم کھائیں۔عربی مدارس کے طلبہ کے لیے بہتر ہوگا اگر سب سے پہلے انہیں اردو زبان وادب کی بقدرِ ضرورت تعلیم دے دی جائے، بعدازاں ان کی تعلیمی مدت کا بیشتر حصہ عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کی عربی تدریس میں لگایا جائے۔مدارس کے تعلیمی دورانیے میں انگلش کی اتنی واقفیت لڑکوں کو بہم کرادی جائے جس سے امید بندھ سکے کہ اگر یہ طلبہ آگے مزید اس زبان کو سیکھنا چاہیں گے تو کسی یونیورسٹی میں اساتذہ سے یا اپنی محنت سے اس میں اتنی مہارت ضرور حاصل کرلیں گے جو اسلام مخالف وموافق لٹریچر اور اخبارات کو سمجھنے، سننے اور جواب دینے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔باقاعدہ کسی علاقائی زبان کو عربی مدارس کے تعلیمی نصاب کا جزو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ بچہ علاقائی زبان کو مادری زبان کے طور پر استعمال تو کرتا ہی ہوگا اس لیے بھی اس ضرورت کم ہوجاتی ہے،مزید یہ کہ ہمارے دینی مدارس میں صرف ایک اسٹیٹ یا علاقے کے طلبہ ہی تعلیم حاصل نہیں کرتے، بلکہ ہندوستان کے کونے کونے سے تشریف لائے ہوتے ہیں۔اس لیے اگر کوئی علاقائی زبان کسی مدرسے کے نصاب کا جزوِ لاینفک بنائی جائے گی تو یہ غیر علاقائی بچوں پر ظلم ہوگا۔

عربی مدارس کے ذمہ داروں کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے طلبہ سب سے پہلے اردو زبان میں مضبوط ہوں، بعدازاں زیادہ سے زیادہ فوکس عربی زبان اور دیگر علومِ دینیہ کی تدریس پر کیا جائے۔اگر مدارس کا نصاب اس طور پر تیار کیا جائے کہ طالبِ علم آسانی سے اور عربی زبان اور علومِ دینیہ کی حق تلفی کیے بغیر کسی عالمی زبان مثلاً انگلش میں مہارت وپختگی حاصل کرلیتا ہے تو بہت خوب، ورنہ انگلش زبان پر دینی علوم اور عربی زبان کو قربان کرنا دینی مدارس کے مقصدِ وجود کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔دینی علوم میں بھی سب سے زیادہ توجہ عربی زبان وادب کی تعلیم پر مبذول ہونی چاہیے۔اب امام بخاریؒ یا علامہ ابن تیمیہؒ جیسا حافظہ رکھنے والے لوگ عنقا ہوگئے ہیں جو ہر بات کو محض سن کر یا ہر عبارت کو محض مطالعہ کرلینے سے ازبر کرلیتے تھے۔دینی علوم فقہ،اصولِ فقہ،حدیث،تفسیرِ قرآن وغیرہ میں آج طلبہ کو کتنا ہی تیار کردیا جائے، مستقبل کی زندگی میں لازماً وہ اپنی یاد کی ہوئی چیزوں میں سے بیشتر کو فراموش کرجائیں گے۔اس وقت لامحالہ انہیں اِن علوم پر مشتمل امہات الکتب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ایسے میں اگر ان کی عربی زبان وادب پر گرفت کمزور ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ وہ مراجعہ کے بعد بھی استفادہ نہیں کرسکیں گے۔اس کے برعکس اگر تعلیمی دورانیے میں عربی زبان وادب پر ان کی پکڑ مضبوط کرادی جائے تو فارغینِ مدارس سے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں بوقتِ ضرورت مناسب مراجع ومصادر سے صحیح استفادہ کرسکیں گے،مزید یہ کہ اگر انہیں علومِ دینیہ سے شغف ہوگا تو ازخود متعدد علوم میں ذاتی مطالعے کی بنیاد پر درک حاصل کرلیں

گے۔ سمجھ میں یہ نہیں آ تا کہ اتنی موٹی سی بات ہمارے اربابِ مدارس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ کہیں دیدہ ودانستہ ان کی کوشش یہ تو نہیں ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ ان ہی کی طرح کورے اور جلد از جلد دینی ماحول اور دینی معلومات کو خیر آباد کہنے والے بن کر رہ جائیں۔ اللہ اعلم۔

اس ضمن میں بیشتر ہندوستانی مدارس میں عربی زبان وادب کی تدریس کا جو انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ بجائے اس کے کہ طلبہ کے اندر اس زبان کے تئیں دلچسپی وشوق کے جذبات پیدا کرے، الٹا انہیں اس زبان سے متنفر کر دیتا ہے کیونکہ وہ ان مدارس کے عربی نصاب کو ایک طلسمِ ہوشربا سمجھتے ہیں جس سے امتحان دے کر جلد از جلد پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن فہمی کی دہائی دے کر جاہلی ادب کی تعلیم وتدریس کی خراد پر انہیں کس دیا جاتا ہے، قطع نظر اس سے کہ موجودہ عربی زبان وادب یا خود قرآن وحدیث کی زبان کی تفہیم وتعلیم میں اس کا کتنا رول ہے اور کیا یہ رول تمام مبتدی ومنتہی طلبہ کے لیے ناگزیر ہے یا اسے تحقیق وتدقیق کی خاطر صرف منتہی طلبہ پر محصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑتا ہے کہ طلبہ عام فہم عربی زبان وادب سے کوسوں دور رہ جاتے ہیں اور جو کچھ جاہلی ادب کے نام پر انہیں زبردستی اور بلا تشویق وترغیب پڑھایا گیا ہوتا ہے وہ بھی فراغت کے بعد ایک دو مہینوں یا سال دو سال میں برابر ہو جاتا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی زبان وادب کی تعلیم میں خاطر خواہ آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم عمومی طور پر ہندوستانی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے وہ منہاجیات ونصابات نہیں پائے جاتے یا علی الاقل ان سے استفادہ نہیں کیا جاتا جو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور بالخصوص عرب ممالک کی تعلیم گاہوں میں استعمال کیے جارہے ہیں۔ ہمارے اربابِ مدارس کی بے خبری اور خود پسندی یا قناعتِ نفسی وخود فریبی کا حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں زبان وادب کی تدریس کے لیے جو طریقے استعمال کیے جارہے ہیں ان سے یہ حضرات خود بے خبر بھی ہوتے ہیں اور احساسِ زیاں سے عاری بھی۔

کسی انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج وغیرہ کے طلبہ وفارغین سے یہ مطالبہ نہیں رکھا جاتا کہ وہ کیوں عربی زبان، یا دینی علوم یا دینی معلومات سے کورے ہوتے ہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں ان کے میدانِ اختصاص سے خارج تصور کی جاتی ہیں۔ پھر کیوں مدارس کے طلبہ ہی کو کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں موردِ الزام ٹھہرایا جائے کہ وہ دینی علوم، عربی زبان، اردو زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں میں بھی قادر الکلام شاعر ونقاد کا رول پلے کرتے دکھائی دیں؟ جس طرح کسی بھی کالج یا یونیورسٹی کا ایک میدانِ اختصاص ہوتا ہے، اسی طرح مدارسِ دینیہ کا میدانِ اختصاص بھی متعین ومعلوم ہے جسے ہم دینی علوم میں تبحر اور ان کی کما حقہ تفہیم وتعلیم کی خاطر قرآن وحدیث کی زبان عربی میں مہارت سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اگر طلبائے مدارس اپنے میدانِ اختصاص ہی میں ''زیرو بٹا زیرو'' ثابت ہوں اور دیگر میدانوں میں کاسہ لیسی

اور گداگری کر کے اگر اپنے آپ کو کامیاب تصور کرتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے مدارس اپنے بنیادی مقصد میں ناکام ہو گئے ہیں یا ناکام کر دیے گئے ہیں۔ جامعۃ الفلاح کا کردار اس معرض میں اور بھی لائق توجہ ہے کہ نصف صدی سے زائد گزر جانے کے باوجود آج تک اس کے دانشمندان و مدبران کسی مستقل نصابِ تعلیم کو تیار نہیں کر سکے۔ نصاب میں ترمیم واضافہ کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن وہ ترمیم واضافہ ہی ہو، کلی تبدیلی نہ ہو۔ نصاب کے کچھ بنیادی موضوعات اور کتابیں ہوتی ہیں جنہیں کسی حال میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جامعۃ الفلاح کے نصاب میں کوئی چیز بنیادی معلوم ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحاح ستہ اور کتبِ فقہ سے چند منتخب ابواب واحادیث کو جیسے تیسے پڑھا کر اور سماجیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی تعریفیں لکھا اور رٹا کر طلبہ کو سندِ عالمیت کے ساتھ چلتا کر دیا جاتا ہے، اور اپنی دانست میں مگن ہو لیا جاتا ہے کہ ہم نے اس اتھلی اور سطحی تعلیم کے ذریعے دین و دنیا کی تفریق مٹانے کا تجدیدی کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ چونکہ دینی علوم میں تبحر سے عاری ہوتے ہیں کہ یہی یہاں کے نصاب کا عملی مقصد ثابت ہو رہا ہے، لیکن باوجود اس کے پندارِ ہمہ دانی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سنجیدہ اور مضبوط دینی نصاب تشکیل دیا جائے جو فی الواقع طلبہ کو منصبِ عالمیت کا اہل بناتا ہو۔

● **جوہر جاوید (فلاحی)**، گیا، بہار۔ موبائیل نمبر: **8409640946**

ہندوستان کے بیشتر دینی مدارس میں درس وتدریس کی زبان اردو ہے۔ اس عام کلیہ سے مستثنیٰ ایک آدھ ریاستیں ہیں جہاں دینی کلیات و جامعات میں درس وتدریس کی زبان کا درجہ علاقائی زبان کو حاصل ہے۔ دینی درس وتدریس کی زبان کا اردو ہونا ایک لازمی امر بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ اسلامی علوم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ اردو زبان میں ہے۔ مزید برآں ہندوستان کے بیشتر علاقے جہاں کی علاقائی زبان اردو کے سوا دوسری ہے وہاں بھی اردو زبان کم از کم دینی حلقے کی شناخت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر عالمی شہرت یافتہ دینی درسگاہیں شمالی ہند میں ہی واقع ہے۔ جہاں ہندوستان کے طول وعرض سے طالبانِ علوم نبوت جوق در جوق آتے ہیں اور علوم اسلامیہ کے فیضان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر مدارس علاقائی زبان کی تدریس کی جانب متوجہ نہیں ہو پاتے، ہندوستان ایک کثیر مذہبی اور کثیر لسانی ملک ہے، اور دعوت دین امت محمدیہ کا اجتماعی نصب العین ہے۔ اس عظیم ترین ذمہ داری کی تکمیل امت مسلمہ کی ترجیحات میں اولین مقام رکھتی ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں دعوت اسلام کے فروغ وارتقاء کے لئے یہ امر مسلم پاتا ہے کہ ہر سال مدارس سے نکلنے والی کثیر تعداد کو ان

زبانوں کی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جائے جو مختلف صوبوں کی علاقائی زبانیں باور کی جاتی ہیں۔شمالی ہند میں زیادہ تر ریاستیں ایسی ہیں جہاں ہندی کو عام بول چال کی زبان سمجھا جاتا ہے۔لہٰذا شمالی ہند کے مدارس میں ہندی زبان کی تدریس نہ صرف وقت کی ایک اہم ضرورت ہے بلکہ فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے بے حد ضروری بھی ہے۔اس جانب منتظمین مدارس اسلامیہ کی عدم توجہ باعث حیرت ہے۔

دوسری جانب جنوب ہند کی ریاستیں اپنی الگ الگ زبانیں رکھتی ہیں۔کرناٹک میں کنڑ،تمل ناڈو میں تیلگو،کیرلا میں ملیالم زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔وہیں بنگال میں بنگالی،آسام میں آسامی اور اڑیسہ میں اڑیہ زبان رائج ہے۔گجرات میں گجراتی بولی جاتی ہے،تو مہاراشٹرا کی زبان مراٹھی ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دعوت دین کا فریضہ مدعو قوم کی زبان میں ہی مؤثر انداز میں ادا کیا جاسکتا ہے۔اس کی وجوہات محتاج بیان نہیں۔زبانیں ایک وسیلہ اظہار ہوتی ہیں اور انسان اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی جتنا حسن وخوبی سے اپنی مادری زبان میں کرسکتا ہے،کسی اور زبان میں نہیں کرسکتا۔دعوت دین کا عمل محض الفاظ کی ادائیگی کا نام نہیں بلکہ اس میں الفاظ سے کہیں زیادہ داعی کے احساسات وجذبات اور واردات قلب کا رول ہوتا ہے۔یہی دعوت کی روح ہے۔اور اس چیز کو ایک داعی جس قدر وکمال وبصیرت کے ساتھ اپنی علاقائی زبان میں ادا کرسکتا ہے کسی اور زبان میں نہیں۔مدعو قوم کی زبان،ان کے رسوم و رواج،تعلقات کی بنیادیں اور سماجی ڈھانچے کو بطریق احسن سمجھے بغیر ان کے دلوں پر دستک دینا ممکن نہیں ہے۔انبیاء کرام کی دعوتی سرگرمیاں بھی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں ہماری اسی جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں کہا گیا ہے ''وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم'' کہ ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ ان پر حق کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ واضح کردیں''۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی فرد واحد بھی اس بات کا منکر ہوگا کہ دعوت دین کا کام مدعو قوم کی زبان میں ہونا چاہئے۔محل بحث جو امر ہے وہ یہ کہ مدارس اسلامیہ جو دینی علوم کے امین ہیں اور طلبائے مدارس جو انبیاء کے وارثین ہیں،کیا ان کو ان کی علاقائی زبان سے اس حد تک روشناس کرانے کی کوشش ہورہی ہے کہ وہ اپنا داعیانہ کردار اپنے متعلقہ علاقے میں ادا کرسکیں یا نہیں۔

میری معلومات کی حد تک جنوبی ہند کی ریاست کیرلا کے علاوہ مرئی طور پر یہ کوشش کسی اور علاقے میں نہیں ہورہی ہے۔کیرالا میں جو دینی درسگاہیں ہیں وہاں ابتدائی درجات سے لے کر بی.اے.کی سطح تک اکثر مضامین ملیالم زبان میں ہی پڑھائے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کیرلا کے لوگ دینی اعتبار سے زیادہ حساس بھی ہیں اور فعال بھی۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ زبان ایک وسیلۂ اظہار ہوتی ہے اور مذہب کو زبان کی ضرورت

پڑتی ہے۔کوئی بھی مذہب خواہ وہ حق کا کتنا ہی بڑا دعویدار ہوا سے وسیلۂ اظہار کے طور پر زبانوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔اس کے بغیر نہ اس کی بقا ممکن ہے اور نہ ہی ارتقاء اور توسیع۔

زبان کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جو عموماً مذاہب کے لٹریچر یا مذہبی کتب میں پائی جاتی ہے۔یہ قدرے مشکل اور دقیق ہوتی ہے۔دقیق زبان اہل علم اور دانشور استعمال کرتے ہیں۔اس حد تک کسی زبان میں کمال پیدا کرنا سونے پر سہاگے کے مانند ہے۔دوسری سطح پر عوام کی زبان ہے۔یہ عام بول چال کی زبان ہوتی ہے اور دقیق و مشکل نہیں ہوتی۔اس سطح کی زبان سیکھنے سے افہام وتفہیم کے مقاصد حاصل ہو جائیں گے اور اس سے دعوتی مقاصد بآسانی پورے کئے جاسکتے ہیں۔

علاقائی زبان کی تمام تر اہمیت کے باوجود ایک سوال ہنوز باقی رہ جاتا ہے کہ عصر حاضر میں مدارس کا نصاب اس کی اجازت دیتا بھی ہے یا نہیں، یا دیتا ہے تو کس حد تک؟

اس بات سے جہاں مجالِ انکار نہیں کہ مدارس کے وجود میں آنے کی اصل غرض وغایت علوم دینیہ کی تحقیق اور اس میں کامل عبور ودسترس پیدا کرنا ہے۔یہ اشاعت اسلام کا نہایت بنیادی زینہ ہے۔وہیں دوسری جانب مدارس کے دعوتی کردار کو فعال بنانا بھی ایک ضروری امر ہے کیونکہ اس سے امت کا اجتماعی نصب العین وابستہ ہے۔

مدارس اسلامیہ میں علاقائی زبانوں کی تدریس کے حوالے سے جو گنجائش نظر آتی ہے، اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ایک یہ کہ جن مدارس یا جامعات کا نظامہائے تعلیم درجہ اطفال اور ثانوی درجات پر مشتمل ہے وہاں علاقائی زبان کی تدریس کا بالکل ابتداء سے ہی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ان آٹھ سالوں کی لمبی مدت میں طالب علم اتنی زبان ضروری جان جائے گا کہ بعد کو اپنی ذاتی لگن اور شوق سے اس کو مزید جلا بخشے اور اچھی دسترس حاصل کرلے۔یہ صورت زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ طلبہ کے لیے اختیاری زبان کے طور پر اس کو اختصاصی درجات میں شامل کیا جائے۔اس مرحلے میں طلبہ کا ذہن قدرے پختہ بھی ہوجاتا ہے، لہٰذا کم مدت میں وہ اس پر اچھی دستگاہ حاصل کرسکتے ہیں۔

بہرحال مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور طریقہ تدریس ہر دور میں لوگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔اور ہر عہد میں اسے مزید بہتر، تخلیقی اور نتیجہ خیز بنانے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی رہی ہیں۔حیات نو کا موجودہ شمارہ بھی مدارس اسلامیہ میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس کی راہیں تلاشنے کی سعی کر رہا ہے۔جس طرح یہ بات اُٹھی ہے اسے قائم رہنا چاہئے، اور مناسب تدابیر کی تلاش ہمہ تن وہمہ گوش جاری رہنی چاہئے۔مروجہ نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کا گہرائی وگیرائی سے جائزہ لیتے رہنا چاہئے تاکہ مدارس اسلامیہ کی عصر حاضر میں افادیت بھی بڑھے اور اس کے کردار میں تنوع بھی پیدا ہو،

اوروہ کثیر آبادی جس سے فارغین مدارس عموماً الگ تھلگ رہ جاتے ہیں وہ ان کے فیضان سے بہرہ مند ہو سکے، اور مدارس اسلامیہ پر رجعت پسندی اور آرتھوڈکسی کا لیبل چسپاں نہ ہو۔

لہٰذا مدارس کے منتظمین حضرات کو گہرے غور وخوض کے بعد ایسے منصوبے بہرصورت وضع کرنے چاہئیں اور ایسی انتظامی تدابیر کرنی چاہئیں کہ فارغین مدارس اپنا داعیانہ کردار بھی اپنے متعلقہ سماج میں بحسن وخوبی ادا کرسکیں، اوراس سے مدارس کا وقار واعتبار اوران کے مقاصد بھی مجروح نہ ہوں۔

فارغین جامعہ متوجہ ہوں

۱) آئندہ ماہ سے حیات نو میں ایک نیا کالم '**بزم ادب**' کے نام سے شروع کیا جارہا ہے۔اس کالم میں فلاحی برادران کی شعری ونثری تخلیقات شامل کی جائیں گی۔فلاحی برادران سے گزارش ہے کہ اپنی نظم وغزل کے علاوہ افسانہ، کہانی، انشائیہ، مختصر ناول وغیرہ بھی ارسال فرمائیں۔

۲) حیات نو میں تعارف وتبصرے کے کالم میں کوشش ہے کہ فلاحی برادران کی کاوشوں کو ترجیح دی جائے، تاہم اس کے لیے گزارش ہے کہ اپنی تصنیف، تالیف، ترتیب، یا ترجمہ کردہ کتابوں کی ۲/۲ کاپیاں ارسال فرمادیں۔

۳) حیات نو کا ایک مستقل کالم اخبار انجمن ہے، اس کالم میں مرکزی انجمن کے علاوہ مختلف یونٹس کی خبروں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ذمہ داران یونٹس اس بات کا اہتمام کریں کہ جب بھی یونٹ میں کوئی ایسی سرگرمی عمل میں آئے، یا یونٹ کے کسی فلاحی بھائی سے متعلق کوئی ایسی خبر ہو جسے فلاحی برادران تک پہنچنا مناسب معلوم ہو تو اسے لازماً مدیر کے نام ارسال فرمادیا کریں۔

۴) گزشتہ دنوں حیات نو میں 'آپ کے خطوط' کا کالم شروع کیا گیا، الحمدللہ کافی کامیاب رہا۔ گزشتہ شمارے کی طرح اس دفعہ بھی اس پر علمی رنگ نمایاں ہے۔فلاحی برادران واساتذہ ووابستگان جامعہ کے لیے اپنے افکار وخیالات شیئر کرنے کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔

کچھ آئندہ شمارے کے بارے میں

(۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع "**<u>ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار</u>**" متعین کیا گیا ہے۔

(۲) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ **۳۰/جولائی** تک ہمیں لازماً موصول ہوجائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے ۲/ **صفحات** سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردوتراجم قرآن پرایک نظر (۴)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ دارالشریعہ۔متحدہ عرب امارات

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر رہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ راقم کا مقصود غلطیوں کو نمایاں کرنا نہیں، بلکہ ترجموں کے تقابلی مطالعہ کی افادیت دکھانا ہے، اور ترجمہ کے عمل میں نظر ثانی اور اجتماعی کاوش کی اہمیت پر زور دینا ہے، کہ فقہی مسائل میں اجتماعی اجتہاد جس قدر ضروری ہے، اس سے زیادہ ضرورت ترجمہ قرآن میں اجتماعی مساعی کی ہے۔

تقابلی مطالعہ بڑی حد تک یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ بیشتر مقامات پر اگر بعض مترجمین یا مفسرین سے کوئی چوک ہوئی ہے تو دوسرے مترجمین کے یہاں اس چوک کا تدارک کرلیا گیا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں کچھ مثالوں کے ذریعہ مختلف نوعیت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں سب سے اہم حصہ عم محترم مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ کے افادات کا ہے جنہیں تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کے ریویو کے دوران نوٹ کرنے کا موقعہ ملا۔

---

(۱) إنَّ اورأنّ میں فرق کی رعایت

ہمزہ پر فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ اِنّ اور اَنَّ کا استعمال ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں جملہ میں تاکید کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے، البتہ کسرہ کی صورت میں وہ جملہ جو اِنّ سے شروع ہوتا ہے لفظی طور سے ایک مستقل جملہ ہوتا ہے، گو کہ سابق سے معنوی ربط پایا جاسکتا ہے، اور اس ربط کا علم سیاق کلام سے حاصل ہوسکتا ہے، لیکن اس کا اظہار لفظ سے نہیں ہوتا۔ جبکہ فتحہ کی صورت میں جو جملہ اَنّ سے شروع ہوتا ہے وہ لفظی طور سے پچھلے جملے کا جزء بنتا ہے، اس کا سابقہ کلام سے گہرا معنوی ربط ہوتا ہے اور اس کا اظہار خود اس لفظ سے ہوتا ہے۔ استعمالات کی روشنی میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسرہ کی صورت میں تاکید کا مفہوم لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جبکہ فتحہ کی صورت میں تاکید کے مفہوم کے مقابلے میں سابق سے ربط کا مفہوم غالب ہوتا ہے۔

مختلف تراجم قرآن پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مترجمین قرآن اکثر مقامات پر اَنَّ کی اس خاص معنویت کا خیال کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات وہ ترجمہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ اِنّ والا معاملہ کردیتے ہیں، جس سے پورے کلام کی معنویت متأثر ہوجاتی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) ذَلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ (الحج:۱۰)

''یہ تیرے ان اعمال کے باعث ہے جو تیرے ہاتھ آگے بھیج چکے تھے اور بیشک اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے''، (طاہر القادری) صاف واضح ہے کہ یہاں اَنَّ کے بجائے اِنّ کا ترجمہ کردیا گیا ہے۔

''یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے'' (سید مودودی) اس ترجمہ میں ورنہ کا استعمال عجیب وغریب ہے۔

''یہ اس کی وجہ سے جو بھیج چکے تیرے دو ہاتھ اور اس وجہ سے کہ اللہ نہیں ظلم کرتا بندوں پر'' (محمود الحسن) اس ترجمہ میں اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

(۲) ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ۔ (یوسف:۵۲)

''یہ اس واسطے کہ (عزیز) جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور یہ بھی کہ اللہ دغابازوں کے ہتھکنڈے چلنے نہیں دیتا''۔ (محمد جوناگڑھی) اس ترجمہ میں اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

''یہ اس لئے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس سے بے وفائی نہیں کی اور بے شک اللہ خائنوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا''۔ (امین احسن اصلاحی) یہاں پہلے اَنّ کا ترجمہ درست ہے لیکن دوسرے لفظ میں اَنّ کے بجائے اِنّ کا ترجمہ کردیا گیا ہے۔

(۳) ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَى وَأَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ وَأَنَّ

السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ۔(الحج:٦،٧)

''یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور یہ کہ وہ مردے جلائے گا اور یہ کہ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اور اس لیے کہ قیامت آنے والی ہے اس میں کچھ شک نہیں، اور یہ کہ اللہ اٹھائے گا انہیں جو قبروں میں ہیں''(احمد رضا خان) اس ترجمہ میں اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

''ان قدرتوں سے ظاہر ہے کہ خدا ہی (قادر مطلق ہے جو) برحق ہے اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کردیتا ہے۔ اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ اور یہ کہ خدا سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں جلا اٹھائے گا''(فتح محمد جالندھری) اس ترجمہ میں بھی اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

''یہ (سب کچھ) اس لئے (ہوتا رہتا) ہے کہ اللہ ہی سچا (خالق اور رب) ہے اور بیشک وہی مردوں (بے جان) کو زندہ (جان دار) کرتا ہے، اور یقیناً وہی ہر چیز پر بڑا قادر ہے، اور بیشک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو زندہ کر کے اٹھا دے گا جو قبروں میں ہوں گے''(طاہر القادری) یہاں اَنَّ کے بجائے اِنّ کا ترجمہ کردیا گیا ہے۔

(۴) وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ۔ (الحج:١٦)

''اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں اتارا ہے (کہ لوگ ہدایت حاصل کریں) اور بے شک اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''(امین احسن اصلاحی) یہاں اَنَّ کے بجائے اِنّ کا ترجمہ کردیا گیا ہے۔

''اور اسی طرح ہم نے اس (پورے قرآن) کو روشن دلائل کی صورت میں نازل فرمایا ہے اور بیشک اللہ جسے ارادہ فرماتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے''(طاہر القادری) یہاں بھی اَنَّ کے بجائے اِنّ کا ترجمہ کردیا گیا ہے۔

''اور یوں اتارا ہم نے یہ قرآن کھلی باتیں اور یہ ہے کہ اللہ سمجھا دیتا ہے جس کو چاہے''۔(محمود الحسن) اس ترجمہ میں اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

''اور ہم نے اس قرآن کو اسی طرح اتارا ہے کھلی کھلی دلیلیں اور یہ کہ اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے"۔(اشرف علی تھانوی) اس ترجمہ میں بھی اَنَّ کی رعایت کی گئی ہے۔

(۵) وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ۔(غافر:٦)

''اور اسی طرح آپ کے رب کا فرمان اُن لوگوں پر پورا ہوکر رہا جنہوں نے کفر کیا تھا بے شک وہ لوگ دوزخ والے ہیں''(طاہر القادری)

''اور یونہی تمہارے رب کی بات کافروں پر ثابت ہوچکی ہے کہ وہ دوزخی ہیں''(احمد رضا خان)

غور طلب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس آیت میں اَنَّ کا ترجمہ بے شک کا کیا ہے، بالکل اسی اسلوب کی ایک اور آیت میں ایسا نہیں کرتے ہیں اور اَنّ کی معنویت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

كَذَلِكَ حَقَّتُ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُواْ أَنَّهُمْ لاَ يُؤْمِنُون۔ (یونس:۳۳)

''اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمہارے رب کی بات صادق آگئی کہ وہ مان کر نہ دیں گے'' (سید مودودی)

''اسی طرح آپ کے رب کا حکم نافرمانوں پر ثابت ہوکر رہا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے'' (طاہر القادری)

''اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہوچکی ہے جنھوں نے نافرمانی کی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے'' (امین احسن اصلاحی)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اَنّ کے ساتھ بعض مترجمین کا مذکورہ رویہ ایک سوچا سمجھا موقف نہیں ہے بلکہ ذہن کے چوک جانے کا نتیجہ ہے۔

تدبر قرآن کے ترجمہ میں جو تفسیر کے ساتھ شائع ہوا ہے اس طرح کی غلطی زیادہ ملتی ہے، البتہ جو ترجمہ تلخیص کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور جس میں نظر ثانی بھی کی گئی ہے، وہاں اَنّ کے قبیل کی کچھ غلطیاں دور کردی گئی ہیں، گوکہ ابھی بھی بہت سارے مقامات تصحیح طلب ہیں۔ تصحیح کی ایک مثال یہاں ذکر کی جاتی ہے:

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوسَى۔ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِيْ وَفَّى۔ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى۔ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى۔ وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنتَهَى۔ وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى۔ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا۔ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى۔ مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَى۔ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَى۔ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَى وَأَقْنَى۔ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَى۔ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَاداً الْأُولَى۔ (سورہ النجم:۳۶۔۵۰)

تفسیر تدبر قرآن میں موجود یعنی نظر ثانی سے قبل کا ترجمہ یہ ہے ''کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسی اور ابراہیم، جس نے اپنے قول پورے کردکھائے، کے صحیفوں میں ہے؟ کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، اور یہ کہ انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہوگی، اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی، پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور یہ کہ سب کا منتہی تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ اور بے شک وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے، اور وہی ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد نر اور ناری پیدا کئے، ایک بوند سے جبکہ وہ ٹپکادی جاتی ہے، اور بے شک دوبارہ اٹھانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے، اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا، اور وہی شعری کا بھی رب ہے۔ اور اسی نے ہلاک کیا عاد اول کو''۔

تلخیص میں موجود ترجمہ یعنی نظر ثانی کے بعد کا ترجمہ یہ ہے ''کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسی اور ابراہیم، جس نے اپنے قول پورے کردکھائے، کے صحیفوں میں ہے؟ کہ کوئی جان کسی دوسرے کا

بوجھ نہیں اٹھائے گی، اور یہ کہ انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہوگی، اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی، پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور یہ کہ سب کا منتہی تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے، اور یہ کہ وہی ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور یہ کہ وہی ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد نر اور ناری پیدا کئے، ایک بوند سے جبکہ وہ ٹپکا دی جاتی ہے، اور یہ کہ دوبارہ اٹھانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے، اور یہ کہ وہی ہے جس نے غنی اور سرمایہ دار کیا، اور یہ کہ وہی شعری کا بھی رب ہے۔ اور اسی نے ہلاک کیا عاد اول کو'۔

غور طلب بات یہ ہے کہ نظر ثانی کے بعد بھی آخری آیت کے ترجمہ میں تصحیح نہیں ہوسکی یعنی ''اور اسی نے ہلاک کیا عاد اول کو'' کے بجائے ''اور یہ کہ اسی نے ہلاک کیا عاد اول کو'' ہونا چاہئے۔

مذکورہ آیتوں کے ترجمہ میں ایک اور کمزوری یہ بھی ہے کہ عربی کے لحاظ سے ان آیتوں میں کہیں پر حصر کا اسلوب ہے اور کہیں پر حصر کا اسلوب نہیں ہے، ہوا یہ کہ جہاں پر حصر کا اسلوب نہیں ہے، وہاں پر بھی حصر کا ترجمہ کر دیا گیا ہے، جیسے وہ کی جگہ پر وہی اور اس کی جگہ پر اسی۔

ان آیتوں کا ترجمہ مولانا امانت اللہ اصلاحی کی تصحیح کے بعد اس طرح ہے، دونوں ترجموں کا گہرا موازنہ قرآن مجید کے طالب علم کے لئے مفید ہوگا:

''کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسی اور ابراہیم، جس نے اپنے قول پورے کر دکھائے، کے صحیفوں میں ہے؟ کہ کوئی ہستی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، اور یہ کہ انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کارکردگی کی ہوگی، اور یہ کہ اس کی کارکردگی کی نوعیت عنقریب سامنے آجائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور یہ کہ سب کا منتہی تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ اور یہ کہ وہ ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے، اور یہ کہ وہ ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور یہ کہ وہ ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد نر اور مادہ پیدا کئے، ایک بوند سے جبکہ وہ ٹپکا دی جاتی ہے، اور یہ کہ دوبارہ اٹھانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے، اور یہ کہ وہ ہے جس نے غنی اور سرمایہ دار کیا، اور یہ کہ وہی شعری کا بھی رب ہے۔ اور یہ کہ اس نے ہلاک کیا عاد اول کو''

(۲) لفظ تغابن کی حقیقت

لفظ تغابن قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر آیا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ۔(التغابن:۹)

اس آیت میں تغابن کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے ہار جیت کا کیا ہے۔ آیت کے مذکورہ ٹکڑے کے کچھ ترجمے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

''اس دن (کو یاد رکھو جب) اللہ اکٹھے کئے جانے کے دن کے لئے تم کو اکٹھا کرے گا۔ وہی دن درحقیقت ہار جیت کا دن ہوگا''۔(امین احسن اصلاحی)

''جس دن تم سب کواس جمع ہونے کے دن جمع کرے گا وہی دن ہے ہار جیت کا'' (محمد جونا گڑھی)

''وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا'' (سید مودودی)

''جس دن وہ تم کو اکھٹا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکھٹا کرے گا وہ نقصان اٹھانے کا دن ہے'' (فتح محمد جالندھری)

''جس دن تم کو اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن وہ دن ہے ہار جیت کا'' (محمود الحسن)

''جس دن وہ تمہیں جمع ہونے کے دن (میدانِ حشر میں) اکٹھا کرے گا یہ ہار اور نقصان ظاہر ہونے کا دن ہے'' (طاہر القادری)

''(اور اس دن کو یاد کرو) جس دن تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا یہی دن ہے سود و زیاں کا'' (اشرف علی تھانوی)

التغابن کا ترجمہ بعض لوگوں نے ہار جیت کیا ہے، لفظ کی حقیقت کے لحاظ سے یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، تغابن کا صحیح ترجمہ سود وزیاں یا نفع ونقصان ہے، تغابن غبن سے نکلا ہے، اور یہ خرید وفروخت میں نقصان اٹھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے، ہار جیت کا مفہوم اس لفظ میں نہیں پایا جاتا ہے۔

اہل لغت میں اس پر اختلاف ہے کہ تغابن میں اشتراک کا مفہوم ہے یا مبالغہ کا، پہلی صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ کسی کو فائدہ اور کسی کو نقصان پہنچنے والا دن۔ اور دوسری صورت میں مطلب ہوگا بہت بڑے نقصان کا دن۔

آیت کے مذکورہ ترجموں پر غور کریں تو کچھ اور بھی کمزور پہلو سامنے آتے ہیں:

اول: بعض مترجمین نے یوم سے پہلے ایک فعل محذوف مقدر مانا ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ''اس دن (کو یاد رکھو جب)'' کہنے کے بجائے ''جب'' اور ''جس دن'' کہہ دینا کافی ہے۔ دراصل اس جملے میں يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ مبتدا اول ہے، ذَٰلِكَ مبتدا ثانی ہے اور يَوْمُ التَّغَابُنِ اس کی خبر ہے۔ اور یہ عربی کا بہت عام اسلوب ہے۔

دوم: لِيَوْمِ الْجَمْعِ کے لام کو بعض نے علت کا سمجھ کر ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''اکٹھے کئے جانے کے دن کے لئے تم کو اکٹھا کرے گا'' حالانکہ یہ لام ظرف کے لئے ہے اور ترجمہ یوں ہوگا: ''اکٹھے کئے جانے کے دن تم کو اکٹھا کرے گا''۔

سوم: یوم الجمع کا ترجمہ بعض لوگوں نے جمع ہونے کا دن اور اکٹھا ہونے کا دن کیا ہے، جبکہ جمع فعل متعدی کا مصدر ہے، اور زیادہ مناسب ترجمہ جمع کرنے کا دن اور اکٹھے کئے جانے کا دن ہوگا۔

چہارم: ذَٰلِكَ کا ترجمہ کرتے ہوئے بعض مترجمین نے حصر کا مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی دن اور وہی دن جیسی تعبیرات کا استعمال کیا ہے، حالانکہ اسلوب کلام حصر کے مفہوم سے خالی ہے، اور

''وہ دن'' کہہ دینا کافی ہے۔

صحیح ترجمہ یوں ہے:

''جب اللہ اکٹھے کیے جانے کے دن تم کو اکٹھا کرے گا، وہ ہوگا نفع ونقصان ظاہر ہونے کا دن''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(۳) نشأ کا مفہوم:

انشاء اور اس کے مشتقات کا قرآن مجید میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ لفظ انشاء کا مفہوم صرف پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل میں نشو ونما دینا اور پروان چڑھانا ہے، ساتھ میں پیدا کرنے کا مفہوم بھی شامل ہوجاتا ہے۔ علامہ ابن فارس کے الفاظ میں:

(نشأ) النون والشين والهمزة أصل صحيح يدلّ على ارتفاعٍ في شئ وسموّ. ونَشأ السَّحابُ: ارتفع. وأنشأه الله: رفعه۔ (معجم مقاییس اللغۃ لابن فارس)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

النشأ والنشأة: احداث الشئ وترتيبه۔ (مفردات القرآن)

ایک حدیث میں عرش کے سائے میں جگہ پانے والوں میں ایک نوجوان ہے جس کی نشو ونما رب کی عبادت میں ہوئی ہو، اس کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا گیا۔

وَشَابٌّ نَشأ في عبادة ربه۔ (البخاری)

ذیل کی آیت جس میں خواتین کا ذکر ہے زیر بحث لفظ کی حقیقت بخوبی واضح کرتی ہے:

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِيُ الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِيُ الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ۔ (الزخرف:۱۸)

اس آیت میں عام طور سے مترجمین نے ینشأ کا ترجمہ پلنے اور پروان چڑھنے کا کیا ہے۔

''اور کیا وہ جو گہنے (زیور) میں پروان چڑھے اور بحث میں صاف بات نہ کرے'' (احمد رضا خان)

لیکن دوسرے بعض مقامات پر مختلف تراجم میں اس کا خیال نہیں کیا جاسکا۔ اور اس لفظ کے مفہوم کو صرف پیدائش تک محدود کردیا گیا۔

چند مثالوں سے بات مزید واضح ہوسکے گی:

(۱) قُلْ هُوَ الَّذِيُ أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُونَ۔ (الملک:۲۳)

اس مقام پر عام طور سے مترجمین نے أَنشَأَكُم کا ترجمہ پیدا کرنا کیا ہے۔

''کہہ دیجئے کہ وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو'' (محمد جونا گڑھی)

جبکہ شیخ الہند کا ترجمہ اس لفظ کی معنویت کو بھرپور طریقہ سے ظاہر کرتا ہے۔

''تو کہہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا، اور بنا دیئے تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو'' (محمود الحسن)

(۲) وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ۔ (الانعام:۱۳۳)

شیخ الہند نے اس دوسرے مقام پر دیگر مترجمین کی طرح پیدا کیا ترجمہ کیا ہے۔

''اور تیرا رب بے پرواہ ہے، رحمت والا اگر چاہے تو تم کو لے جاوے اور تمہارے پیچھے قائم کردے جس کو چاہے جیسا کہ تم کو پیدا کیا اوروں کی اولاد سے'' (محمود الحسن، ایک اور توجہ طلب امر یہ ہے کہ الغنی کا ترجمہ بے پرواہ کے بجائے بے نیاز کرنا صحیح ہے)

''اور تیرا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تم کو فنا کردے اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے لائے، جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے'' (امین احسن اصلاحی)

اس مقام پر سید مودودی نے پیدا کرنے کے بجائے اٹھانا کیا ہے جو لفظ کی حقیقت سے زیادہ قریب ہے:

''تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے جس طرح اُس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے'' (سید مودودی)

یہاں پر ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ تم کو دوسرے لوگوں سے پیدا کیا یہ کیوں کہا کہ دوسروں کی اولاد سے پیدا کیا؟ مولانا امانت اللہ اصلاحی نے جو مفہوم اختیار کیا ہے اس سے یہ اشکال دور ہوجاتا ہے، ان کے مطابق یہاں من تجرید کا ہے، مطلب یہ ہوگا کہ ''جس طرح سے تمہاری نشو ونما کی ہے دوسروں کی اولاد کی صورت میں''۔ یا دوسروں کی اولاد بنا کر۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح پہلے اس عالم گیتی میں دوسرے تھے جن کی تم اولاد ہو، وہ نہیں رہے اور ان کی جگہ تم ہو، اسی طرح اللہ جب چاہے تم کو نابود کرکے دوسروں کو تمہاری جگہ لاسکتا ہے۔

(۳) أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ۔ أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ۔ عَلَى أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَى فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ (الواقعۃ:۵۸-۶۲)

''ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے، اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کردیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو،

پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟'' (سید مودودی)

''ہم ٹھہرا چکے ہیں تم میں مرنا، اور ہم عاجز نہیں، اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں جہاں تم نہیں جانتے۔ اور تم جان چکے ہو پہلا اٹھان پھر یاد کیوں نہیں کرتے'' (محمود الحسن)

پہلے ترجمہ میں کمزوری یہ ہے کہ پیدائش کا ترجمہ کیا گیا ہے، جبکہ مراد نشوونما ہے، مزید یہ کہ قدرنا کا ترجمہ تقسیم کرنا کیا گیا ہے، حالانکہ صحیح ترجمہ مقدر کرنا ہے۔ دوسرے ترجمہ میں کمزوری یہ ہے کہ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُم کا مطلب انسانوں کی جگہ دوسروں کو لا نا لیا گیا ہے، جبکہ اس سے مراد انسانوں کی موجودہ شکل و ہیئت بدل کر دوسری شکل و ہیئت کے ساتھ انہیں نشوونما دینا ہے۔

درست ترجمہ حسب ذیل ہے:

''ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کی ہے اور ہم عاجز رہنے والے نہیں ہیں اس بات سے کہ تمہاری شکل وصورت بدل دیں، اور تم کو نشوونما دیں ایسی صورت میں جسے تم نہیں جانتے۔ اور پہلی نشوونما تو تم جانتے ہی ہو تو سبق کیوں نہیں حاصل کرتے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۴) إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاء۔ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارا۔ (الواقعۃ: ۳۵،۳۶)

یہاں بھی بعض مترجمین نے پیدا کرنے کے مفہوم کو اختیار کیا ہے، جیسے:

''ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا'' (فتح محمد جالندھری، اس ترجمہ میں مفعول مطلق کا مفہوم بھی نہیں ادا ہوسکا)

''ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے'' (سید مودودی) (اس ترجمہ میں فعل ماضی سے مستقبل کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش غیر ضروری ہے)

جبکہ بعض دوسرے مترجمین نے لفظ کا حق ادا کیا ہے جیسے:

''بیشک ہم نے ان عورتوں کو اچھی اٹھان اٹھایا'' (احمد رضا خان)

''ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو اچھی اٹھان پر'' (محمود الحسن)

''(اور ان کی بیویاں ہوں گی) جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہوگا، پس ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں'' (امین احسن اصلاحی) (اس ترجمہ میں ماضی کے دونوں افعال کو غیر ضروری طور سے مستقبل کا معنی پہنانے کی کوشش کی گئی ہے جو درست نہیں ہے، صحیح ترجمہ ہوگا:

''ان کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہے، پس ہم نے انہیں بنادیا ہے کنواریاں'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۴) زمین سے پیدائش یا زمین سے نشوونما؟

قرآن مجید میں بعض مقامات پر انسانوں کے سیاق میں انشاء اور انبات کے عمل کو زمین سے جوڑا

گیا ہے، اس کی تفسیر میں بعض لوگوں کا ذہن اس طرف گیا کہ انسان کے تکوینی عناصر وہی ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں، اور بعض نے اس کی تفسیر قرآن مجید کے اس بیان کو سامنے رکھ کر کی جس میں انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی بات کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ طین سے پیدا کرنا اور ارض سے پیدا کرنا ایک ہی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ یہاں پیدائش نہیں بلکہ نشو ونما کی طرف اشارہ ہے اور بتانا مقصود یہ ہے کہ انسان کو نشو ونما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کا انتظام اللہ نے زمین میں فرما دیا ہے۔ مذکورہ آیتوں میں یہ اسلوب بیان ہوا ہے۔

(۱) وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا۔ (ھود:۶۱)

عام طور سے مترجمین نے اس آیت میں پیدا کرنے کا ترجمہ کیا ہے، جیسے:

''اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے'' (سید مودودی)

جبکہ یہاں ترجمہ ہونا چاہئے:

''اسی نے تم کو زمین سے نشو ونما دی'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۲) هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ۔ (النجم:۳۲)

''وہ تمہیں خوب جانتا ہے تمہیں مٹی سے پیدا کیا'' (احمد رضا خان)

''وہ تمھیں اُس وقت سے خوب جانتا ہے جب اُس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا'' (سید مودودی)

''وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہاری زندگی کی ابتداء اور نشو ونما زمین (یعنی مٹی) سے کی تھی'' (طاہر القادری)

''وہ تم کو خوب جانتا ہے جب بنا نکالا تم کو زمین سے'' (محمود الحسن)

یہاں بھی لفظ کی رعایت سے درست ترجمہ اس طرح ہوگا:

''وہ تم کو خوب جانتا ہے جبکہ اس نے تمہیں نشو ونما دی زمین سے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۳) وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتاً (نوح:۱۷)

اس آیت میں بعض لوگوں نے زمین سے اگانے کا ترجمہ کیا ہے، تو بعض لوگوں نے زمین سے پیدا کرنے کا کیا ہے، جیسے:

''اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا'' (سید مودودی)

''اور اللہ نے تمہیں سبزے کی طرح زمین سے اُگایا'' (احمد رضا خان)
''اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے'' (فتح محمد جالندھری)
''اور تم کو زمین سے ایک (خاص اہتمام سے) اگایا ہے (اور پیدا کیا ہے)'' (محمد جوناگڑھی)
مولانا امانت اللہ اصلاحی اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:
''اور اللہ نے خاص انداز سے زمین سے تمہاری نشوونما فرمائی''

دراصل جس طرح انشاء کا اصل مفہوم نشوونما دینا ہے اسی طرح انبات کا بھی اصل مفہوم نشوونما دینا ہی ہے، انشاء اور انبات میں، ہم معنی ہونے کے ساتھ خاص فرق یہ ہے کہ انشاء جانداروں کے لئے خاص ہے اور بطور استعارہ نباتات کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ انبات نباتات کے لئے خاص ہے اور بطور استعارہ غیر نباتات کے لئے استعمال ہوتا ہے، انشاء کے بارے میں علامہ راغب لکھتے ہیں: وأكثر ما يقال ذلك في الحيوان۔ وقوله تعالى: أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ۔ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِؤُونَ۔ (الواقعة: ۷۱۔۷۲) فلتشبيه ايجاد النار المستخرجة بايجاد الانسان۔ (مفردات القرآن)

انبات کے بارے میں علامہ ابن فارس لکھتے ہیں: النون والباء والتاء أصل واحد يدلّ على نماءٍ في مزروع، ثم يستعار۔ (معجم مقاییس اللغۃ)۔

انبات کا اصل مفہوم نشوونما دینا ہے، یہ ذیل کی آیت سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے:
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتاً حَسَناً۔ (آل عمران: ۳۷) یقینی طور پر اس آیت میں پیدا کرنے یا اگانے کا ترجمہ درست نہیں ہوگا۔
''پس اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول فرمایا اور اسے بہترین پرورش دی'' (محمد جوناگڑھی)
''تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھا پروان چڑھایا'' (احمد رضا خان)
''تو پروردگار نے اس کو پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور اسے اچھی طرح پرورش کیا'' (فتح محمد جالندھری)

بالکل اسی طرح سورہ نوح کی مذکورہ بالا آیت میں بھی پرورش کرنا مراد ہے، البتہ وہاں من الارض کا اضافہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ نشوونما کا انتظام جس طرح نباتات کے لئے زمین سے ہوتا ہے اسی طرح انسانوں کی نشوونما کا انتظام بھی اللہ نے زمین میں کر دیا ہے۔

(۵) فرض علیہ اور فرض لہ کے درمیان فرق

فرض کے ساتھ جب علی آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کچھ فرض کرنے اور لازم کرنے کے ہوتے ہیں،
قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ۔ (الأحزاب: ۵۰)
''ہم کو اچھی طرح معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''ہم کومعلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں''(سید مودودی)

صحیح بخاری کی حسب ذیل حدیث میں فرض علی دوبار آیا ہے اور دونوں جگہ اس کا مفہوم واجب کرنا ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه و سلم لما بعث معاذا، رضي الله عنه، على اليمن، قال انك تقدم على قوم أهل الكتاب فليكن اول ما تدعوهم اليه عبادة الله فاذا عرفوا الله فاخبرهم أن الله قد فرض عليهم خمس صلوات في يومهم وليلتهم، فاذا فعلوا فأخبرهم أن الله فرض عليهم زكاة (تؤخذ) من أموالهم وترد على فقرائهم، فاذا أطاعوا بها فخذ منهم وتوق كرائم أموال الناس۔

البتہ فرض کے ساتھ جب لام آتا ہے تو مفہوم کسی کے اوپر کچھ لازم کرنے اور عائد کرنے کا نہیں ہوتا، بلکہ کسی کے لئے کچھ مقرر کرنے کا ہوتا ہے۔ ذیل کی دو مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے:

(الف) لَاجُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ إِن طَلَّقۡتُمُ النِّسَاء مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ أَوۡ تَفۡرِضُواۡ لَهُنَّ فَرِیۡضَة۔ (البقرۃ:۲۳۶)

''اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے یا ان کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو تو تم پر کچھ گناہ نہیں''(جالندھری)

(ب)وَإِن طَلَّقۡتُمُوهُنَّ مِن قَبۡلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِیۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ۔(البقرۃ:۲۳۷)

''اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا''(جالندھری)

دونوں مقامات پر عام طور سے مترجمین نے مہر مقرر کرنے کا مفہوم ذکر کیا ہے۔

تاہم فرض علی کے مقابلے میں فرض لہ کا یہ اہم فرق بعض ترجموں میں ملحوظ نہیں رکھا جاسکا، ذیل کی مثالوں میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے:

(ا) مَّا کَانَ عَلَى النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللَّهُ لَه۔(الاحزاب:۳۸)

''اور نبی کے لئے اللہ نے جو کچھ فرض کیا اس میں کوئی تنگی نہیں ہے''(امین احسن اصلاحی)

''اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کام (کی انجام دہی) میں کوئی حرج نہیں ہے جو اللہ نے ان کے لئے فرض فرما دیا ہے''(طاہر القادری)

''نبی کے لئے خدا کے فرائض میں کوئی حرج نہیں ہے''(جوادی)

غور طلب امر یہ ہے کہ یہاں بات کسی ایسے فرض کی نہیں ہورہی ہے جو نبی پر عائد کیا گیا ہو، بلکہ

اللہ نے نبی کے لئے ایک بات مقرر کی ہے، اور یہ بتایا جارہا ہے کہ اسے انجام دینے میں نبی کے لئے کوئی حرج نہیں ہے۔ درست ترجمہ یہ ہے:

''نبی پر کوئی حرج نہیں اس بات میں جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمائی'' (احمد رضا خان)

(۲) قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ۔ (التحریم:۲)

''اللہ نے تمہاری (خلاف شرع) قسموں کا توڑ دینا تم پر فرض کر دیا ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''خدا نے فرض قرار دیا ہے کہ اپنی قسم کو کفارہ دے کر ختم کر دیجئے'' (جوادی)

یہاں بھی یہ نہیں بتایا جارہا ہے کہ قسموں کو توڑنا فرض ہے، بلکہ یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ نے قسموں سے آزاد ہونے کا طریقہ بتا دیا ہے، اس لئے آزادی کے ساتھ خدا کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کے بجائے خود اپنی قسموں کی پابندی میں گرفتار رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ درست ترجمہ یہ ہے:

''اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے'' (سید مودودی)

إِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَى مَعَادٍ۔ (القصص:۸۵)

اس آیت میں فرض کے ساتھ علی آیا ہے، اس لئے اردو مترجمین میں سے بڑی تعداد نے ترجمہ فرض کرنا کیا ہے، جیسے:

''اے نبی، یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے'' (سید مودودی) علامہ راغب اصفہانی نے یہی مفہوم اختیار کیا ہے: وقال: إِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْآن (القصص:٨٥)، أی: أوجب علیك العمل به۔ (مفردات القرآن)

البتہ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ نازل کرنا کیا ہے، جیسے: ''جس اللہ نے آپ پر قرآن نازل فرمایا ہے وہ آپ کو دوبارہ پہلی جگہ لانے والا ہے'' (محمد جوناگڑھی)

اس آیت میں فرض کا مطلب نازل کرنا عرب مفسرین کے یہاں بھی ملتا ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں: و "فَرَضَ" معناه أنزل۔ (تفسیر القرطبی:۱۳/۳۲۱)۔ لگتا ہے ان لوگوں کو یہ اشکال ہوا کہ قرآن پر فرض کئے جانے کا اطلاق کیسے کیا جائے، فرض کئے جانے کی چیز تو احکام ہوتے ہیں۔

تاہم علامہ طاہر بن عاشور کا خیال ہے کہ یہاں بھی فرض مقرر کرنے کے معنی میں ہے، اور علی وجوب کا مفہوم ادا کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ بتانے کے لئے ہے کہ یہاں فعل انزل کی تضمین ہے جس کا صلہ علی ہے جسے ذکر کر دیا گیا ہے۔ گویا مطلب ہوگا اللہ نے تمہارے لئے قرآن کو منتخب کر کے تم پر نازل کیا۔ علامہ لکھتے ہیں: ومعنى (فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآن) اختاره لك من قولهم: فرض له كذا، اذا عين له فرضا، أی نصيبا۔ ولما ضمن (فرض) معنى (أنزل) لأن فرض القرآن هو انزاله، عدى فرض بحرف (على)۔ (التحریر والتنویر:۲۰/۱۲۰)

شفق طاہری کے نعتیہ کلام کی معنوی جہتیں

نعیم احمد غازی فلاحی، رکن مجلس شوریٰ انجمن طلبہ قدیم ومجلس انتظامیہ جامعۃ الفلاح

''**آئینہ نور**'' عزیز احمد خاں شفق طاہری کے دوسرے نعتیہ مجموعۂ کلام کا نام ہے۔اس سے پہلے ان کا نعتیہ مجموعۂ کلام ''نور کی نہریں جاری ہیں'' ۲۰۰۵ء میں طبع ہوا تھا، جسے اہلِ دل اور اصحابِ نظر نے کافی پسند کیا تھا،اور اسے بے پناہ پذیرائی بھی حاصل ہوئی تھی۔میرے عزیز دوست سید راشد حامدی صاحب کے توسط سے مجھے ان کا پہلا مجموعۂ کلام پڑھنے کا موقع ملا۔پہلے میں نے یہی سمجھا کہ نعت کا یہ مجموعۂ کلام بھی عام روش کے مطابق ہوگا جس میں عبد اور معبود کے درمیان فرق کو ملحوظ نہ رکھ کر نعت کے وقار کو مجروح کیا گیا ہوگا، مگر ایک دن جب میں نے یوں ہی وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی شروع کی تو میں چونکا۔ان کی ندرتِ کلام اور نزاکت بیان نے مجھے اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔کچھ نعتوں نے تو مجھ پر سرشاری اور وجد کی سی کیفیت طاری کر دی۔میں سوچنے لگا کہ اسے سیپارۂ نعت کہوں یا سیپارۂ ایمان و یقیں،اسے اعجازِ ہنر قرار دوں یا کسی کا فیضانِ نظر۔حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کا اعجازِ ہنر بھی ہے اور مولانا سید حامد علی مرحوم ومغفور کے فیضانِ نظر اور ان کے فیضِ تربیت کا کمال بھی۔کیونکہ حضرت شفق طاہری کا تعلق بھی شاہجہانپور کی اسی بستی میران پور کٹرہ سے ہے جو مولانا محترم کا مولد ومسکن ہی نہیں ان کا اولین میدانِ کار بھی رہا ہے۔مولانا مرحوم کی نگاہِ جوہر شناس نے شفق طاہری کے اندر نہاں جوہر کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ اسے تراش خراش کر حریفِ سنگ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔''نور کی نہریں جاری ہیں'' میں مجھے جن اشعار نے سب سے زیادہ متاثر کیا میری خواہش ہے کہ آپ بھی ان اشعار کی تلاوت کریں۔ تلاوت کا لفظ میں نے دانستہ طور پر استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ اشعار معنوی اعتبار سے اتنے مقدس ہیں کہ ان کی باوضو تلاوت کرنا عبادت کے زمرے میں آتا ہے۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

دین حق کی سربلندی کے لیے آئے رسول
معجزہ یہ ہے کہ قرآنِ مبیں لائے رسول
سربراہانِ جہاں بونے نظر آنے لگے
جب سے دیکھا ہے کتابوں میں سراپائے رسول

اس قدر پاسِ امانت تھا کہ ساری زندگی
چین کا اک سانس بھی لینے نہیں پائے رسول

کلامِ حق ہے کہ تنہا نہیں ہے جانِ رسول
خدا کی ساری خدائی ہے درمیانِ رسول
جب اُن کے سامنے دنیا سنور کے آتی ہے
نواز دیتے ہیں ٹھوکر سے عاشقانِ رسول
فضا میں نغمۂ توحید گونج اُٹھتا ہے
جدھر جدھر سے گزرتا ہے کاروانِ رسول

اب اس انداز سے کردار بنایا جائے
آپ کی ذات کو معیار بنایا جائے
ساری دنیا کو دیا جائے خدا کا پیغام
اک جہاں مطلعِ انوار بنایا جائے
قافلے آج بھی منزل پہ پہنچ سکتے ہیں
آپ کو قافلہ سالار بنایا جائے

کسی سے وعدہ کیا ہے اُس نے چلو کہ دیکھیں
وہ تین دن سے وہیں کھڑا ہے ،مجھے پتا ہے
لہو لہو ہورہا ہے وہ پتھروں سے لیکن
لبوں پہ اُس کے کوئی دعا ہے ،مجھے پتا ہے

ایک ایک شعر کو بغور پڑھیے ،آپ کو کہیں مبالغہ نظر آئے گا نہ حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی عقیدت ومحبت۔ایسا لگتا ہے کہ یہ نعت کے اشعار نہیں قرآنی آیات یا قرآن واحادیث سے مستفاد مفاہیم کو نظم کا پیکر عطا کر دیا گیا ہے۔شفق طاہری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے آپ سے اور آپ کی شانِ رسالت سے خالی خولی عقیدت ومحبت کے دعوے نہیں کیے ہیں بلکہ آپ کے پیغام اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو معیارِ زندگی بنانے پر زور دیا ہے،آپ کے اخلاق،آپ کے کردار اور آپ کے عادات واطوار کو اپنانے اور اُسے مشعل راہ بنانے پر زور دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مجھے ان کی بیشتر نعتوں سے ایک روشنی سی پھوٹتی نظر آتی ہے جو بیرون سے اندرون کی طرف سفر کرتی ہوئی پورے وجود کو منور وتابناک بنا دیتی ہے۔دورانِ مطالعہ مجھے بار ہا ایسا محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ قوت کشاں کشاں مجھے روضۂ مصطفیٰ کی جانب کھینچے لیے جارہی ہے،اور تقدس کے ایک غیر مرئی ہالے نے مجھے اپنی پناہوں میں لے رکھا ہے۔

ضرورت ہو جسے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے
جہاں بھر کے لیے آیا ہے آئینہ محمد کا
میں ابلیسِ لعیں سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں
یہی ظالم تو دشمن ہے فروغِ دینِ احمد کا
وہی معیارِ حق ، مطلوبِ حق ، منظورِ حق ٹھہرے
ان ہی کی ذات پیمانہ ہے ساری کاوش وکد کا

یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

سرورِ دیں کی ذات وصفات
جیسے قرآں کی آیات
ایک نظامِ فکر و عمل
آپ کی سیرت ،آپ کی ذات
کالے ہوں یا گورے ہوں
سب پر آپ کے احسانات

میں نے بارہا سوچا کہ حضرت شفق طاہری کو فون کر کے یا خط لکھ کر انہیں ان کے اس معجز بیاں کلام پر مبارک دوں مگر شہری زندگی اور اس کی مصروفیات ہمیشہ آڑے آتی رہیں اور میں چاہ کر بھی یہ کارِ خیر انجام نہ دے سکا۔ جب مجھے یہ خبر ملی کہ شفق طاہری صاحب کا دوسرا نعتیہ مجموعۂ کلام طباعت کے مرحلے میں ہے تو میں نے سوچا کہ ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں ''آئینۂ نور'' کے آئینہ میں ان کے کلام کو دیکھنے کی سعادت حاصل کروں۔

حضرت شفق طاہری کے تازہ مجموعۂ کلام ''آئینۂ نور'' کو بلاشبہ ایمان کی تہذیب، یقین کی شائستگی اور ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار'' کی حقیقی تعبیر کہا جا سکتا ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں عشق و سرمستی بھی ہے مگر کمالِ احتیاط کے ساتھ،اس میں شوخی اور والہانہ پن بھی ہے مگر کامل ایمان و یقین کے ساتھ، ان کی نعتوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار بھی ہے مگر رسالت و وحدانیت کے درمیان پائے جانے والے واضح فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے، پورے مجموعہ کلام میں جہاں سے بھی دیکھیں،آپ اس میں ایمان و یقین اور عقیدت و محبت کی ایک ایسی فضا محسوس کریں گے جسے صرف اور صرف اہل دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ ان کی شعری واردات میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی شعری اساس اور مجدد دوراں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی فکری اصابت جلوہ گر نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

دفترِ کائنات میں غور تو کیجیے ذرا
عقل تمام بولہب ، عشق تمام مصطفیٰ

فقط دستِ دعا کچھ بھی نہیں ہے
کلیمی بے عصا کچھ بھی نہیں ہے
اگر باقی نہیں معیارِ سنّت
یہ مسجد ، مدرسہ کچھ بھی نہیں ہے

نعت گوئی آسان کام نہیں ہے۔حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ اردو شاعری کی سب سے مشکل صنف سخن ہے۔عام طور پر اس فن کے ماہرین نے اسے دودھاری تلوار پر چلنے کے مترادف قرار دیا ہے مگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ اس سے بھی خطرناک اور مشکل امر ہے۔اس کا حق ادا کرنا تو دور اس کو صحیح العقیدگی کے ساتھ کسی طرح نبھالے جانا بھی کمال فن اور متانت ہنر کی بات ہے۔کیونکہ حمد اور نعت کے مابین جو نازک سا فرق ہے اس کو ملحوظ رکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔آپ کی عقیدت و محبت میں تھوڑا سا غلو عقیدۂ توحید کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں ذرا سی لغزش حبطِ اعمال اور دنیا و عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ حضرت شفق طاہری وادیِ نعت سے سرخ رو گزرے ہیں۔انھوں نے اپنی عقیدتوں کو اُس بے جا مبالغہ آرائی اور غیر مناسب مدح سرائی سے کوسوں دور رکھا ہے جسے عام طور پر اس میدان میدان میں جائز سمجھ لیا گیا ہے جس نے ان کے کلام میں ایک امتیازی شان پیدا کر دی ہے۔سید راشد حامدی اپنے استاد کے پہلے مجموعۂ کلام ''نور کی نہریں جاری ہیں'' میں اُن کے نعتیہ کلام کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شفق طاہری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عبد و معبود کے مابین نازک فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے نعت گوئی کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔انھوں نے کہیں بھی خلطِ مراتب کی غلطی نہیں کی ہے۔ اللہ کو اس کے اعلیٰ مرتبے پر اور رسول کو ان کے امتیازی مقام پر جگہ دی ہے۔ان کی نظر میں رسولِ اکرمؐ خیر البشر، فخر موجوداتِ کل کائنات اور امام الانبیاء ہیں، فوق البشر نہیں۔وہ اس حد سے بخوبی واقف ہیں جس سے گزر جانے کے بعد نعت، نعت نہیں حمد ہو جاتی ہے اور عبد معبود کے درجے میں داخل ہو جاتا ہے۔

ان کی نعتوں میں وہی جذب وشوق، وہی محبت و عقیدت، وہی وارفتگی و شیفتگی اور وہی عشق و جنون پایا جاتا ہے جو مومن کا حقیقی سرمایہ ہے۔جس ایمانی جذبہ اور فکری حرارت کے ساتھ یہ نعتیں کہی گئی ہیں وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع میں عقیدت و محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا ہے۔حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ایک سچا مومن اور صحیح العقیدہ مسلمان ہی اس دشوار گزار راستے سے بسلامتیِ ایمان و یقین گزر سکتا ہے۔''

حضرتِ شفق طاہری نے اپنی نعت گوئی سے خوش عقیدگی اور بدعقیدگی کے درمیان ایک حدِّ فاصل قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ایسا ہرگز نہیں کہ ان کی نعتوں میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں محبت وعقیدت، وارفتگی وشیفتگی اور خودسپردگی میں کوئی کمی پائی جاتی ہے بلکہ حمد ونعت کے درمیان اس متوازن اور معتدل اندازِ فکر نے جو قرآن وسنّت پر مبنی ہے اُن کے کلام میں مزید والہانہ پن اور خود سپردگی کا عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے جس کی مثال دورِ حاضر کے نعت گو شعرا کے یہاں کم ہی ملتی ہے۔چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کتابِ پاک تو موجود ہے عصا ہی نہیں
ہمارے عہد کا فرعون ڈوبتا ہی نہیں
صفائے پاکیِ طینت کہاں سے آپائے
زمانہ آپ کے اوصاف جانتا ہی نہیں

ٹپکتی رہتی ہیں دن رات عطر کی بوندیں
کوئی نچوڑ گیا ہے گلاب آنکھوں میں
مدینے جانے کی حسرت مچلتی رہتی ہے
نہ دل میں صبر کی طاقت، نہ تاب آنکھوں میں

نفرتوں کا طلسمِ طاغوتی
تم نہ آتے تو ٹوٹتا ہی نہیں
آپ کا نام دل پہ لکھا تھا
یہ چراغ آج تک بجھا ہی نہیں
دل مدینے میں بھول آئے ہم
زندگی میں کوئی مزا ہی نہیں

ان کی نعتوں کی سب سے اہم خوبی جس کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو یقیناً ناانصافی ہوگی وہ یہ ہے کہ انہوں نے سیرتِ نبوی اور اسوہ حسنہ کے اصل پیغام کو اجاگر کرنے اور اسے حرزِ جاں بنانے پر زور دیا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ حمد ونعت کو ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے اور ان کے حسنات میں اضافہ کرے۔آمین

کیا مسافر تھے......

ماسٹر شاہ عالم فلاحی، سابق استاذ انگریزی لٹریچر، شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

فجیرہ دوبئی سے الگ ایک خودمختار ریاست ہے۔ سنسان اور عریاں پہاڑوں کے سلسلوں سے گھری ہوئی۔ نظافت و نفاست کا ایک عمدہ نمونہ ہے تو حسن و دلکشی کا نادر خطہ ہے۔ سڑکوں سے لگے کھجور کے غیر منقطع درخت زائرین کو عجیب حسن پیش کرتے ہیں، ۱۹/جولائی بروز جمعہ بوقت ۳/ بجے دوپہر دوبئی سے ہم بس پر سوار ہوکر چل پڑے۔ یہ تین سو کلومیٹر کی مسافت ہے، پر لذت سفر نے ہم کو تھکن سے بیگانہ کردیا تھا

چوم لیا ہر نقش وفا کو پیار کی مشکل راہوں نے
کھوئے کھوئے سہمے سہمے آپ جو میرے ساتھ چلے

بقول غبار خاطر کے مصنف ''اللہ تعالیٰ نے کسی بھی خطہ ارض یا انسان کو اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کیا ہے۔ سورج روز چمکتا ہے تو امیروں کے محلوں کو صرف شاد کام نہیں کرتا ہے بلکہ غریب کی جھونپڑی بھی اس کے نور سے سرفراز ہوتی ہے۔'' تاحد نگاہ پھیلا یہ پہاڑی سلسلہ گو کہ بے کیف ہے، لیکن دولت و ثروت کے حصول کا زبردست وسیلہ ہے۔ ان کے وجود سے بیاباں نشینوں کو بہت زیادہ سرمایہ نصیب ہوتا ہے۔ ان کا وجود ان کے مکینوں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے، تو دوسری جانب یہ صعوبت سے پر زندگی کے عکاس بھی ہیں۔ بلاشبہ زندگی کبھی یہاں تلخ جاں تھی، لیکن یہ ایک ابدی صداقت ہے کہ ''عظمت زندگی صعوبتِ زیست میں مخفی ہے''۔

زندگی کا اگر بخوبی اور فراخدلانہ جائزہ لیا جائے۔ اور تاریخ کے صفحات میں اگر کوئی اقوام و ملل کی ترقیوں و پستیوں کا غائر مطالعہ کرے تو یہ سچائی کھل کر سامنے آتی ہے کہ رفعتِ زیست و عظمتِ حیات اُن کا حصہ بنتی ہے جو لذت سفر سے بخوبی آشنا ہیں، اور جن کی روحیں منزلِ سفر کے حصول سے گھبراتی نہیں ہیں۔ اسی عظیم نقطہ کی طرف ''سونے کا شہر'' "AL Derado" نامی مضمون میں مضمون نگار نے ذہن کو مرتکز کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس عظیم سرمایہ حیات کی عظمت کی طرف برصغیر ہند کی مایہ ناز شخصیت اور جماعت اسلامی کے اول قائد و بانی مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک تصنیف میں یوں اشارہ کیا ہے کہ: ''جب کسی قوم یا فرد کو اپنی ترقی پر اطمینان ہوجاتا ہے، اسی دن اس کی تنزلی کا آغاز ہوتا ہے''۔ اس کی اہمیت کا شدید احساس جب شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کو ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے امت اسلامیہ کے جوانوں کے لیے شوقِ سفر کے ابدی و نہ ختم ہونے کی دعا ان الفاظ میں کی کہ

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

جن ارواح نے اس دنیا کی سچی تحلیل کی ہے ان کو بخوبی علم ہوگیا تھا کہ سفر ہی زندگی کا حاصل ہے۔ایسے ہی لوگ ماضی و حال کے درد سے بیگانہ ہوتے ہیں۔فکر بہت تلخ جاں ہے اور اسیری بھی، اگر انسان ماضی و مستقبل کی طلسمی زنجیروں میں پھنس جائے۔ایسی طبیعت کا مالک چاہے اس دنیا کا کتنا بڑا انسان بن جائے، دولت و ثروت کا چاہے کتنا ہی سرمایہ حاصل کرلے، لیکن لذت زیست سے وہ تہی داماں ہوگا۔

جیسے ہی لفظ ''دیوانگی'' میرے تختۂ دماغ پر وارد ہوا، میں تخیل کی حسین وادی میں جا پہنچا۔ایک بار پھر بس کی کھڑکی سے چپک گیا، اور تاحد نگاہ پھیلے خاموش پہاڑی سلسلے اور بھیانک اور ہولے ہولے کرتے بیابانوں سے اشارے کی زبان میں ہم کلام ہوا۔ان سے میری پرشوق نگاہیں کچھ اس انداز سے گفتگو کر رہی تھیں؛

''اے بے زبان رفیقو! تمہارا وجود بہت قدیم ہے۔شاید زمانے سے بھی پرانا ہے۔ذرا مجھے اس وقت کی داستان سنا اور ان دیوانوں کی کتابِ زیست کے اوراق ذرا پھر پلٹ جن کے خاموش وجود سے تیرے پیچ گھری وادیاں آج بھی معطر ہیں۔آج بھی تیری بادِ نسیم میں ان کی جانثاری و سرفرازی کی لطیف خوشبو چھپی ہے، اور تیرے وجود کے چہرے جن کی نرالی محبت و الفت کا غازہ آج بھی لگائے نظر آتے ہیں، گوکہ یہ بات ایک کھری صداقت بن چکی ہے کہ تہذیب نو کے مصنوعی غازے نے اس عالم گیر صداقت کو مٹانے کی ہر آن سعی لاحاصل کی ہے۔

یہ خاموش بیاباں اور جلتی پہاڑیاں مجھ سے کچھ یوں ہم کلام ہوئیں:

''اے حضرت انسان! ایمان و یقین کے دعویدار! ان جیالوں کی سیدھی سادی داستانِ زیست بہت خونچکاں ہے، میرا دل اتنا مضبوط نہیں ہے۔تیرے ایمان و یقین کی بصارت میں اتنی قوت و طاقت نہیں جو ان دیوانوں کی داستانوں کو پڑھ سکے۔تو مدنیت کے آغوش میں پلا ہے۔تہذیب نو کی عیاری و مکاری سے تیرے ایمان کے اموکے کی آبیاری ہوئی ہے۔تیرا تخیل اتنا بلند کہاں، تیرے یقین کی شمع میں وہ تابنا کی کہاں جو حال و مستقبل کے دریچوں سے جھانک کر ان کی شمع افروز داستان پڑھ لے۔تو تو دعوائے ایمان کے بعد مشرق و مغرب اور من و تو کی پرفریب زنجیر میں اسیر ہے۔تیرا ان سے رشتہ نہیں ہے۔تو دعوائے ایمان ہے اور ان کی زندگی سراپا ایمان تھی۔تو حلاوتِ ایمان و یقین سے محروم ہے، اور ان کا وجود بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی کے مشابہ تھا۔ہمارے وجود کی تاریک و بھیانک خاموشیاں اور ویرانیاں ان سعید روحوں کے قدم مبارک سے آج بھی تاباں ہیں۔ان کے مخفی وجود کی حلاوت سے ابھی بھی ہماری روح ناقابل بیان لذت سے شادکام ہوتی ہے۔اس سچائی کو تو کتابوں کے اوراق میں نہیں پاسکتا۔ہماری خاموشیاں ان کی جرأت رندانہ و براہیمی ایمان و یقین کی شہادت یوں پیش کرتی ہیں ؎

اف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کر جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہِ گزر سے گزرے

تعارف وتبصرہ

عبدالرحمن خالد فلاحی،سابق لائبریرین جامعۃ الفلاح

الموعظہ الحسنہ

تصنیف: جمعہ امین عبدالعزیز، **ترجمہ**: ضمیر الحسن خاں فلاحی

صفحات:۱۹۲/، **قیمت**:۱۵۰/، **ناشر**: چنار پبلی کیشنز سری نگر، جموں وکشمیر۔۲۰۱۳ء

کتاب کے مشمولات اس طرح ہیں: وحدت دین کا قرآنی تصور، یوم حنین، قمری تقویم اور اس کی حکمت، صبر اور زندہ اقوام، حاکمیت الٰہ، مسلم اتحاد اور دشمنان اسلام کا رویہ، ایمان اور اسلام وغیرہ۔

یہ کتاب امام حسن البنا شہیدؒ کے دروس قرآنی پر مشتمل ہے جو آپ نے مختلف مواقع پر دیئے ہیں۔ حسن البنا شہید کہتے ہیں ''قرآن پاک کی ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالو اور دیکھو یہ کیا چاہتی ہیں۔ ہمارا مقصود ان آیات کی فقہی تفسیر کرنا، توجیہ وتاویل کے نئے نئے نکتے پیش کرنا اور مسائل کا استنباط کرنا نہیں ہے بلکہ ہم ان آیات کے پیغام کو سمجھنے کے متمنی وآرزومند ہیں''۔ ان دروس میں ایک قسم کی جادو بیانی ہے جو ہر ایک کے دل کو چھو لینے والی ہے، ان قرآنی آیات سے آپ نے سماجی، معاشرتی واخلاقی اصول مستنبط کیے ہیں، جن پر عمل پیرا ہوکر ہم اپنے معاشرے کی تربیت کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب جہاں طلبہ تحریک کے لیے مفید تر ہے وہیں عام انسانوں کی رہنمائی کے لیے بھی مفید ہے۔ مترجم نے عربی زبان کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے، زبان بہت ہی خوبصورت اور عام فہم ہے، امید کہ اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

مجلہ بیاد ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ

ادارت: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی، ابوالاعلی سید سبحانی

صفحات:۲۱۰/، **قیمت**: درج نہیں، **ناشر**: الجامعہ الاسلامیہ شانتا پورم کیرلا

یہ مجلّہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم سابق چانسلر الجامعہ الاسلامیہ شانتا پورم کیرلا کی خدمات عالیہ کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس کے مضامین کچھ اس طرح ہیں: خراج عقیدت، شخصی تأثرات، ڈاکٹر صاحب کا نظریہ تصوف ایک تجزیاتی

مطالعہ، اسلامی اکیڈمی کا قیام، بحیثیت چانسلر الجامعہ الاسلامیہ آپ کی خدمات، امیر جماعت اسلامی ہند، خیالات وافکار، تصانیف وتراجم کا مختصر تعارف، مضامین کا انتخاب۔

ڈاکٹر عبدالحق انصاری ایک زبردست عالم، عظیم مفکر، مایہ ناز محقق، دوررس قائد، مشفق مربی اور پرسوز داعی تھے۔ آپ جدید نافع اور قدیم صالح کا حسین وجمیل سنگم تھے۔ آپ قرآن وحدیث، علم کلام، فلسفہ وتصوف اور تقابل ادیان میں میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ ساتھ ہی اردو، ہندی، سنسکرت، انگریزی، عربی، جرمن، فرنچ، اور عبرانی زبانوں کے عالم تھے۔ آپ کو درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کا عملی تجربہ بھی تھا۔ آپ اپنی عمر کے آخری دور میں الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم کے چانسلر اور جماعت اسلامی ہند کے امیر رہے۔

آپ کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں جامعہ کے ذمہ داران ڈاکٹر عبدالسلام احمد، شیخ عبداللہ منہام، جناب وی کے علی، ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا سید جلال الدین عمری، نائب امیر جناب صدیق حسن صاحب، وجناب محمد جعفر صاحب، قیم جماعت جناب نصرت علی صاحب، اساتذہ جامعہ اور ملک وملت کی اہم شخصیات شامل ہیں۔ ان کے رشحات قلم سے آپ کی زندگی کے متعدد اہم گوشے سامنے آگئے ہیں۔ اللہ آپ کی خدمات عالیہ کو قبول کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

آؤ قرآن کی طرف

تصنیف: آسیہ فلاحی

صفحات: ۸۰/، **قیمت**: ۶۰/روپے، **ناشر**: جی-ایل پرنٹرس، نئی دہلی ۔۲۰۱۳ء

یہ کتاب چند مضامین اور مقالات پر مشتمل ہے، جو اس طرح ہیں: رجوع الی القرآن کی ضرورت واہمیت، اسلامی نظریہ تعلیم اور بچیوں کی تعلیم وتربیت، تعمیر انسانیت اور والدین، جاہلیت کی ہمہ گیر گرفت اور اسلام، فکری انقلاب وقت کی ضرورت، تفقہ فی الدین وقت کی ضرورت۔

ایک دور تھا کہ بچیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا جبکہ بچیوں کی تعلیم کا چلن عام ہو چکا ہے لیکن یہ تعلیم خواتین کے لیے کس طرح سودمند ہو سکے پس پردہ کیا جذبات واحساسات اور طریقہ کار ہونے چاہئیں، اس کا سمجھنا ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تعلیم کے نام پر ترقی یافتہ جاہلیت کا دور دورہ ہو جائے، اور بچیوں کی دینی تعلیم کے وہ مقاصد پورے نہ ہو سکیں جو مطلوب ہیں۔ یہ مصنفہ کے احساسات کی ترجمانی ہے۔ دینی تعلیم کا مقصد فرد کی شخصیت کی صحیح تربیت ونشوونما ہے، تاکہ اپنی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق بسر کر سکے۔ اس کے حصول کے لیے رجوع الی القرآن ضروری ہے کیونکہ یہی ایک کتاب ہے جو ایسا نظام فکر وعمل پیش کرتی ہے جس میں انسان کی اعتقادی، عملی، ظاہری وباطنی، انفرادی واجتماعی قومی وبین الاقوامی غرض ہر شعبہ زندگی سے متعلق رہنمائی موجود ہے۔ تعلیم ایک معاشرتی اور مقصدی عمل ہے۔ تعلیم کا محور وہ افکار واعمال ہوتے ہیں جو معاشرے کی اکثریت کے نزدیک مقبول ہوتے ہیں جن کو

ماہرین تعلیم منتخب کرتے ہیں لیکن اسلامی نظریہ تعلیم قرآن وحدیث سے مستنبط ہوتا ہے، اوراخلاقی اقدار کونشو ونما دینے والا ہوتا ہے۔ جس سے ذہنی، اخلاقی وجسمانی تربیت ہوتی ہے اور رجوع الی القرآن کا یہی منتہا ومقصود ہے۔

اسلامی نظریہ تعلیم عصر حاضر کے تناظر میں

تصنیف: ام شہاب فلاحی

صفحات: ۴۷/، **قیمت**: ۲۰/روپے، **ناشر**: جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ

کتاب کے مشتملات اس طرح ہیں: تعلیم کی اہمیت، اسلام کا نظریہ تعلیم، ہندوستان کا پہلا اسلامی مدرسہ، علم کی وحدت، مسلمان اور سائنسی علوم، پروفیشنل کورسیز وغیرہ۔

نواستعماریت انفرادی آزادی کو ایک قابل صرف شئے کا درجہ دیتی ہے۔ فرد کی آزادی جو اپنے آپ میں قدر نہیں رکھتی بلکہ اس کی قدر علمی ومعاشی افزائش کی نسبت سے ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں استعمار زدہ عوام کی آزادی محدود ہوجاتی ہے۔ جب صنعتی ترقی کی ابتداء ہوئی تو اس وقت مردوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ صنعتی پیداوار کے لیے کافی ہو، اس لیے انہوں نے مجبوراً عورتوں کو مساوات کا درس دے دے کر کارخانوں میں کام کرنے پر آمادہ کرلیا۔ جب عورتوں نے قدم گھر سے باہر نکال دیا اور مردوں کے ہم سر ہوگئیں تو اب کیسے چہار دیواری کے اندر جاسکتی تھیں۔ سرمایہ دارانہ نظام تعلیم کا مقصد ہی فرد کی سماج اور معاشرے میں قیمت خرید متعین کرنا ہے، جیسا کہ آج کل انجینئرنگ اور مینجمنٹ اور کھیل کے افراد کی قیمتیں لگ رہی ہیں۔ لیکن اسلام کا نظریہ تعلیم فرد کی شخصیت کی مناسب نشو ونما، اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارنا ہے، تاکہ اس کے اندر نیک وبد کی تمیز ہو۔ خدا اور بندے کا رشتہ استوار ہو، یہ اسلامی نظریہ تعلیم ہی کی بنیاد پر ہوسکتا ہے کہ ایک طرف انسان خدا شناس ہو تو دوسری طرف فرض شناس اور سماج کا وفادار ہو۔

ریڈنگ کمپری ہنس کورس فار اردو لرنرس

مؤلف: ڈاکٹر مونس فلاحی

صفحات: ۱۲۴/، **قیمت**: ۱۵۰/، **ناشر**: ناردن ریجنل لنگویج سینٹر، پنجاب یونیورسٹی کیمپس، پنجاب

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ بیسک کورس، انٹرمیڈیٹ کورس، ایڈوانس کورس۔ ڈاکٹر مونس فلاحی نے اردو زبان سیکھنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے یہ ایک اچھی کتاب تیار کی ہے، اس کتاب میں موصوف نے بنیادی باتوں کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ مثال کے طور پر مواد کی زبان آسان وعام فہم اور موضوع دلچسپ ہوتا کہ ابتدائی معلومات آسانی سے قاری کی سمجھ میں آجائیں۔ ان کا ذوق مطالعہ تیز سے تیز تر ہو۔ صلاحیتوں میں تیز اضافہ ہو۔ وہ خود مختارانہ طور پر اردو زبان وادب کا مطالعہ کرسکیں۔ مؤلف نے عام فہم ادبی شہ پاروں کا انتخاب کرکے ان پہ مشقی سوالات وجوابات اہتمام کیا ہے، تاکہ قاری میں خوداعتمادی پیدا ہو۔

آپ کے خطوط

الحمدللہ گزشتہ شمارے سے متعلق قارئین کے تأثرات کافی بڑی تعداد میں موصول ہوئے، البتہ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تأثرات کوشامل اشاعت کرناممکن نہ تھا، چنانچہ یہاں معذرت کے ساتھ محض چند خطوط کی اشاعت پراکتفا کیا جارہا ہے۔ **مدیر)**

نسیم غازی فلاحی، اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ، نئی دہلی

مجلّہ حیات نو کا شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء ملا۔ جس لگن اور محنت سے شمارہ تیار کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اس شمارے میں قرآن مجید کی آیت 'ما أصاب من مصيبة' کے سلسلے میں مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی اور ایک ایسی چیز سامنے آگئی جس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ ہر شمارہ میں قرآن کے مشکل مقامات پر کچھ نہ کچھ رہنمائی ضرور کیا کریں۔ بہتر ہوگا کہ عزیزم مدیر حیات نو احباب کے مشورے سے ایک فہرست ایسے مقامات کی اصلاحی صاحب کوفراہم کردیں۔

حکیم محمد ایوب ایوارڈ کی رپورٹ مع فوٹوگرافس دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اپنے محسنین کے احسانوں کے اعتراف کی یہ ایک اچھی کوشش ہے جو مطلوب بھی ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا۔ حکیم محمد ایوب صاحب کی زندگی کے گونا گوں پہلو ہیں مثلاً ان کے طریقہ علاج ومعالجہ اور مریضوں سے ان کا تعلق، تحریک اسلامی سے ان کی وابستگی کی نوعیت، عام مسلمانوں اور غیر مسلموں سے ان کا تعلق، ان کی فیاضی اور دریا دلی، ان کی دلیری اور شجاعت وغیرہ، ان سب کے علاوہ ان کی زندگی کا ایک اور اہم پہلو ہے اور وہ ہے ہمارے خاندان سے ان کا تعلق، نیز ہمارے خاندان کے کئی افراد کے اسلام میں آنے کے سلسلے میں حکیم صاحب اور ان کے اہل خانہ کا رول۔ میں ارادہ رکھتا ہوں کہ اپنے محسن کی زندگی کے اس آخرالذکر پہلو پر کچھ لکھوں، الحمد للہ اس سلسلے میں کام شروع ہو چکا ہے اور توقع ہے چار یا پانچ قسطوں پر یہ محیط ہوگا۔ ان شاء اللہ اس پہلو کے منظر عام پر آنے کے بعد فارغین حکیم صاحب کے اس داعیانہ کردار کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے اور ہر ایک کی خواہش ہوگی کہ وہ بھی اس کردار کو اپنائے۔

رضوان احمد فلاحی، لندن

حیات نو کے تازہ شمارے (جنوری-مارچ ۲۰۱۴ء) میں میڈیا اور مدارس پر مباحثہ اچھا ہے۔ لکھنے والوں نے توازن کے ساتھ موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ بصری ذریعہ ابلاغ (ٹی وی) کے متعلق بعض علماء کے خیالات کا

تذکرہ ایک تحریر میں آیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہم مسلک علماء پڑوسی ملک میں جس بھرپور طریقے سے ٹی وی پر آتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں جواز وعدم جواز کی بحث سرے سے ختم ہو چکی ہے۔ پون صدی سے زائد کا عرصہ ہوا جب اسی کے مماثل رویہ نماز کے لیے مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے متعلق اختیار کیا گیا تھا اور اب مشکل ہی سے کوئی مسجد اس کے بغیر ملے۔ شاید ٹی وی کے معاملہ میں بھی مستقبل میں یہی ہو۔

<u>ڈاکٹر محی الدین غازی</u>، متحدہ عرب امارات

علمی گروہ کی نمائندگی کرنے والے رسالہ کے لئے زیبا یہی ہے کہ اس کا خطوط ومراسلات کا کالم بھی مدح وتعریف کے بجائے علمی گفتگو سے بھرپور ہو۔ سابق سے پیشتر شمارہ میں محترم نسیم غازی فلاحی صاحب نے ایک علمی بحث کا آغاز کیا، اور سابقہ شمارہ میں استاذ محترم مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے اس علمی بحث کو آگے بڑھا کر ہم شاگردوں کی علمی دلچسپی کا بھرپور انتظام کیا۔ اپنے مکتوب میں استاذ محترم نے لفظ مصیب (اسم فاعل مذکر) کے بارے میں یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ اچھے اور برے دونوں معنی میں آتا ہے، لفظ مصیبۃ (اسم فاعل مونث) کے بارے میں یہ تحقیق پیش کی کہ ہر حال میں اس کا مطلب آفت اور مصیبت ہی ہوتا ہے۔ تائید میں کلام عرب سے مثالیں بھی پیش کیں، جن سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ لفظ مصیبۃ کلام عرب میں آفت ومصیبت کے لئے خوب استعمال ہوتا ہے، البتہ دوسرے معانی کی نفی نہیں ہوتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طالب علم کے اندر تحقیق کا جو کچھ ذوق پیدا ہوا اس میں استاذ محترم کی توجہ کا خاص حصہ ہے، اسی تربیت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ بھی اس موضوع پر کچھ تلاش کرے۔ تلاش کا حاصل بڑے ادب سے استاذ محترم اور قارئین کی پیش خدمت ہے:

قرآن مجید کے استعمالات کی حد تک یہ بات قرین صواب لگتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ مصیبۃ ہر جگہ آفت ومصیبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تاہم کلام عرب میں بھی لفظ مصیبۃ ہر جگہ آفت ومصیبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اس کا خود کلام عرب سے اثبات نہیں ہوتا۔ اہل لغت کے مطابق دراصل یہ لفظ تیر کے نشانے پر جا لگنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہیں سے اگر کوئی درست بات تک پہونچ جائے یا کسی کو کچھ لاحق ہو جائے تو اس کے لئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ اس میں مذکر اور مونث کی کوئی تفریق دلیل سے ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ لفظ مصیب کے برخلاف چونکہ لفظ مصیبۃ مصیبت وآفت کا ایک مشہور نام بھی ہے، اس لیے دوسرے معنوں میں اس کا استعمال کم ہوتا ہے۔

مذکورہ ذیل مثالوں سے اس کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے:

ابوفراس حمدانی کہتا ہے:

ارامیتی کل السهام مصیبة

وانت لي الرامي وكلي مقاتل

اے مجھ پر تیر چلانے والی، سارے تیر نشانے پر لگے ہیں، تو مجھ پر تیر چلا رہی ہے اور میرا پورا وجود تیرے تیروں سے زخمی ہے۔

ابوالعلاء معری کہتا ہے:

وسهـــــــام دهـــــــرك لا تـــــــزال مـــــصيبة

صــــرفــت بـــاذن الـلـــــه عــن اخـــطـــائهـــا

تیرے زمانے کے سارے تیر نشانے پر لگتے ہیں، اللہ کے حکم سے انہیں خطا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔(اس شعر میں سہام الدھر سے مراد مصیبتیں ہیں، لیکن لفظ مصیبۃ کا مطلب مصیبت نہیں ہے)

بشار بن برد کہتا ہے:

فـــوالــلــــــــه مــــــا ادري و كـــل مـــصيبة

بـــــأي مـــكيـــدات الـــنســـــاء أكـــــاد

اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ عورتوں کی کس چال کا نشانہ بن جاؤں گا، امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی ساری چالیں کامیاب ہوتی ہیں۔

قاسم حداد اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں مصیبۃ کے لفظ کا زبردست استعمال کرتا ہے:

يريدون اقناع الشعب، كم هو على خطا، وأن نظرة القائد هي مصيبة، انها مصيبة حقا

وہ عوام کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ کس قدر غلطی پر ہیں، اور یہ کہ قائد کی نگاہ ہی مصیبت (درست) ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصیبت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

یہاں پہلے لفظ مصیبۃ کا مطلب درست ہونا ہے اور دوسرے کا مطلب آفت و مصیبت ہے۔

عربی زبان میں آفت و مصیبت کے لئے بہت سارے نام ہیں جیسے نائبۃ، نازلۃ وغیرہ، ان میں ایک مصیبۃ بھی ہے، اور اس کی بھی وجہ تسمیہ غالباً یہ عام تاثر ہے کہ مصیبت جس کو نشانہ بناتی ہے وہ بچ نہیں پاتا۔

جمیل محمد فلاحی، کیرلا (حال مقیم قطر)

بھائی ابوالاعلی امید ہے خیریت سے ہوں گے، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی آپ ماہنامہ رفیق منزل کے ساتھ ساتھ سہ ماہی حیات نو کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال رہے ہیں۔ حیات نو کا تازہ شمارہ میں نے پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ مجھے اس سے پہلے کے شمارے بھی بذریعہ ای میل بھیج دیں، خاص طور پر غازی بھائی کا اردو تراجم قرآن پر جو قسط وار مضمون آرہا ہے، اس کو ضرور بھیجئے۔

میں اس وقت دوحہ (قطر) میں ہوں، حیات نو کے توسط سے ہمارے تمام اساتذہ کرام بالخصوص مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور مولانا سلامت اللہ اصلاحی کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

مادر علمی میں ایس آئی او آف انڈیا کی کل ہند طلبۂ مدارس کانفرنس

مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی محرک کیا تھا؟ اور وہ بنیادی مقاصد کیا تھے جن کے تحت مدارس کا قیام عمل میں آیا؟ مدراس کی موجودہ صورتحال کیا ہے؟ کیا ان کے درمیان کچھ بھی فکری ہم آہنگی نظر آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ نظام، نصاب اور دیگر بنیادی امور میں ان کے درمیان اس قدر اختلاف یا فرق پایا جاتا ہے کہ کسی ایک مکتب فکر کے مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے دوسرے مکاتب فکر کے مدارس میں ایڈجسٹ ہونا مشکل، بلکہ محال ہوتا ہے۔ فارغین مدارس سے کیا توقعات وابستہ رکھی جاتی ہیں، یا وابستہ رکھی جانی چاہئیں؟ سماج کی تشکیل نو اور سماجی مسائل کے حل کے سلسلے میں ان کا کیا کردار مطلوب ہے؟ اور پھر مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ وطالبات کی مجموعی صورتحال کیا ہے؟ کیا بحیثیت مجموعی وہ ملک وملت کی تعمیر میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں؟ اسی طرح یہ کہ مدارس اسلامیہ کے واقعی مسائل کیا ہیں؟ کیا مسائل ہیں جن کا تعلق ملت کی اندرونی صورتحال سے ہے، کیا مسائل ہیں جو مدارس کے اسٹرکچر اور ان کے نظام ونصاب سے متعلق ہیں، کیا مسائل ہیں جو طلبہ اور فارغین مدارس کو مدرسے سے باہر کی دنیا میں جانے پر درپیش ہوتے ہیں، اور پھر وہ کیا مسائل ہیں جو بیرون سے الزامات اور غلط فہمیوں کی شکل میں مدارس کے اوپر تھوپے جارہے ہیں، اور مدارس کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں۔

یہ اور اس جیسے کچھ اور بہت ہی بنیادی نوعیت کے سوالات ہیں، جو ۱۱؍اپریل کو ایس آئی او آف انڈیا کی جانب سے منعقد 'کل ہند طلبہ مدارس کانفرنس' بمقام جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ میں بہت ہی زور وشور سے اٹھائے گئے۔ اس کانفرنس میں ملک کے مختلف صوبوں سے منتخب طلبہ مدارس کے علاوہ مختلف مکاتب فکر کے اہل علم ودانش بھی موجود تھے۔ تاہم ہر ایک کی گفتگو سے مدارس کی موجودہ صورتحال کے تعلق سے ایک ہی جیسی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

افتتاحی سیشن صبح ۹؍بجے شروع ہوا۔ جس کی نظامت برادر نجم الثاقب فلاحی، صدر حلقہ ایس آئی او یوپی سنٹرل نے کی۔ استقبالیہ برادر عبدالودود سکریٹری ایس آئی او آف انڈیا نے پیش کیا۔ کلیدی خطاب صدر ایس آئی او آف انڈیا اشفاق احمد شریف کا تھا۔ اس سیشن میں ایک اہم پروگرام مذاکرے کا تھا، جس کا عنوان تھا ''مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی محرک''۔ اس میں مختلف مکاتب فکر کی نمائندہ شخصیات مولانا علاؤالدین ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء،

مولانا ولی اللہ سعیدی، امیر حلقہ یو پی مشرق جماعت اسلامی ہند، مولانا اسعد اعظمی، جامعہ سلفیہ بنارس، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی لکھنؤ یونیورسٹی نے اظہار خیال کیا، صدارت مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند نے فرمائی۔ بنیادی طور پر جملہ شرکاءِ مذاکرہ اس امر پر متفق تھے کہ مدارس اسلامیہ کے قیام کے بنیادی محرک پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ دوسرے سیشن کی صدارت جناب مولانا رفیق احمد قاسمی سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے فرمائی، اور نظامت عبدالعظیم فلاحی، حیدرآباد نے کی، اس سیشن میں ۵؍خطاب ہوئے۔ جس میں جناب اشہد رفیق ندوی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جناب مولانا محمد اسماعیل فلاحی صاحب، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، جناب مولانا عمر اسلم اصلاحی صاحب شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، مولانا وارث مظہری صاحب استاذ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد اور ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی لکھنؤ نے خطاب کیا۔ آخری سیشن خطاب عام کا تھا جس میں قرب وجوار سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، اس سیشن کی نظامت نذیر الحسن فلاحی، صدر ایس آئی او حلقہ یو پی مغرب نے کی، اور مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی امیر حلقہ جماعت اسلامی یو پی مشرق اور مولانا علاؤ الدین ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے خطاب کیا۔ آخر میں سات نکاتی قرارداد منظور کی گئی، جسے مدیر رفیق منزل وسہ ماہی حیات نو ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے پیش کیا۔

یقیناً مدارس ملت اسلامیہ ہند کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں، اور ان کی اپنی شاندار تاریخ اور ملک وملت کے لیے عظیم ترین خدمات رہی ہیں، جن کا اعتراف کیا جاتا ہے، اپنوں کی جانب سے بھی، اور غیروں کی جانب سے بھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مدارس اسلامیہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ وقت کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکے۔ وقت اپنی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا گیا، راگ میں بھی جدت آئی، ساز بھی تبدیل ہوا، اور خرد نے نہ جانے کتنی منزلیں طے کرلیں، لیکن اس تبدیلی کا کوئی قابل ذکر اثر مدارس کے نظام ونصاب پر نہیں پڑا۔ ایس آئی او آف انڈیا نے اس میقات میں یہ عزم کیا ہے کہ مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم ونصاب تعلیم کو ملک بھر میں موضوع بحث بنایا جائے گا، اس کے تحت ملک بھر میں جگہ جگہ سروے بھی جاری ہیں، اس کے علاوہ بھی مختلف نوع کے پروگرامس طے کئے گئے ہیں، ان ہی پروگرامس کا ایک حصہ طلبہ مدارس کی یہ کل ہند کانفرنس تھی۔ یقیناً طلبۂ مدارس کی یہ کل ہند کانفرنس ایک نقطہ آغاز ہے، اس میدان میں قدم بڑھانے کے لیے ابھی بہت کچھ تیاری اور عملی جدوجہد درکار ہے۔

سیرت نگاری میں ہندوستانی علماء کا حصہ

یکم مارچ ۲۰۱۴ء بروز شنبہ کو ''سیرت نگاری میں ہندوستانی علماء کا حصہ'' کے موضوع پر پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی (ڈین فیکلٹی آف دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا ایک لکچر ہوا۔ آپ نے اپنے لکچر میں فرمایا کہ قرآن کی تفسیر کی طرح ہر زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر لکھنے کا سلسلہ رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ موصوف نے ہندوستانی علماء میں عبدالحق محدث دہلوی کی دلائل النبوۃ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی منہاج النبوۃ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی علماء کا سیرت پاک لکھنے کا پہلا محرک میلاد اور دوسرا محرک مناظرہ اور تیسرا محرک تحقیق تھا۔ جس کے تحت سیرت کی کتابیں لکھی گئیں۔

ڈاکٹر فائز کا توسیعی لکچر

۳؍ مارچ بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں ڈاکٹر محمد فائز (اسسٹنٹ پروفیسر MANUU) کا ایک توسیعی لکچر ہوا۔ آپ نے انگریزی زبان اور طلبہ مدارس کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بچہ پہلے سنتا ہے پھر بولتا ہے پھر پڑھتا اور لکھتا ہے۔ انگریزی سیکھنے کے لیے پہلے سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہوگا تب انگریزی آئے گی۔ انگریزی بولنے کے لیے ضروری کہ یہ علم ہو کہ کس لفظ کا ٹون کیسا ہو، کیسے اس کو ادا کرنا ہے اور کس طرح سے ٹون بدلنے سے معانی میں فرق آجاتا ہے۔ آپ نے عملی مشق کے ذریعے اہم نکات کی وضاحت کی۔ آخر میں سوال و جواب کا اہتمام بھی ہوا۔

علامہ اقبال کی نظم جبرئیل و ابلیس

۸؍ مارچ بروز شنبہ کو ابواللیث ہال میں جناب ڈاکٹر خالد محمود صاحب (سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) کا ایک توسیعی لکچر ''علامہ اقبال کی نظم جبرئیل و ابلیس'' کے موضوع پر ہوا۔ اخیر میں انہوں نے طلبہ کے سوالوں کے جواب بھی دیے۔ اختتامی کلمات پروفیسر اشتیاق ظلّی صاحب نے پیش کیے۔

دعوتی حکمت عملی، عہد مکی کی روشنی میں

۲۲؍ مارچ بروز شنبہ ابواللیث ہال میں جناب پروفیسر یسین مظہر صدیقی صاحب کا ''دعوتی حکمت عملی، عہد مکی کی روشنی میں'' کے عنوان پر ایک توسیعی لکچر ہوا۔ موصوف نے اپنے لکچر میں فرمایا کہ ہندوستان اور اس جیسے دوسرے ممالک کے لیے آپ ﷺ کا مکی دور اپنے اندر بڑی حکیمانہ درس لیے ہوئے ہے۔ مکی دور اور ہمارے ہندوستانی معاشرے میں کئی پہلوؤں سے مماثلت ہے، مسلمانان ہند کو اس پہلو پر سوچنا چاہئے۔

جامعہ میں عظیم الشان نعتیہ مشاعرہ

یکم مارچ ۲۰۱۴ء، جامعۃ الفلاح میں ایک عظیم الشان نعتیہ مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب (ناظم جامعۃ الفلاح) کی صدارت نے اس مشاعرے کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نعتیہ محفلوں کے انعقاد کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے اس قسم کی روحانی محفلوں کو تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب کے لیے ضروری قرار دیا۔ بعد ازاں مولانا نے باہر سے تشریف لائے شعراء کرام ڈاکٹر تابش مہدی، سید راشد حامدی فلاحی، زبیر ابن سیفی، سعد امروہوی، اور عمیر منظر فلاحی کو شال اوڑھا کر اعزاز و تکریم سے نوازا۔ جن شعراء کا کلام دلچسپی سے سنا گیا ان میں ڈاکٹر تابش مہدی، سید راشد حامدی فلاحی، زبیر بن سیفی، سعد امروہوی، خبیر مبارکپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ عمیر منظر فلاحی کی خوبصورت اور برجستہ نظامت کو بھی خوب سراہا گیا۔ نصف شب کے بعد یہ نورانی محفل مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے کلمات تشکر کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

جدید اردو شاعری پر توسیعی لکچر

۳؍مارچ بروز دوشنبہ ''جدید اردو شاعری'' کے موضوع پر ڈاکٹر عمیر منظر فلاحی (اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد یونیورسٹی، لکھنؤ) کا لکچر ہوا۔ آپ نے بتایا کہ اردو کے شاعروں میں پہلا نام سعود شاہ مسلماں کا نام ملتا ہے لیکن ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ولی دکنی سے غالب تک ایک دور ہے۔ غالب آخری قدیم کلاسیکی شاعر تھے۔ موصوف نے کہا کہ جدید اردو شاعری کے سوتے حالی اور حسین آزاد سے ملتے ہیں۔

شیخ محمد قطب اور شیخ نادر کے انتقال پر ملال پر تعزیتی نشست

۱۹؍مارچ ۲۰۱۴ء بروز شنبہ ابو اللیث ہال میں ایک تعزیتی نشست محمد قطبؒ اور شیخ نادر نوریؒ کی وفات کی مناسبت سے منعقد ہوئی۔ محمد قطبؒ کا جامع تعارف، ہجرت، خدمات کا تعارف بزبان عربی برادرز کی الرحمٰن غازی فلاحی (استاذ جامعہ) نے کرایا۔ شیخ نادر نوری کی حیات وخدمات کا مختصر تعارف اور ان کے تئیں تعزیتی کلمات برادر عبدالعظیم فلاحی (استاذ جامعہ) نے پیش فرمائے۔ آپ نے کہا کہ شیخ نادر نوری کا جامعہ سے خصوصی تعلق تھا۔ مرکز الدعوۃ ان کی نوازشوں اور عنایتوں کا مظہر ہے۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

۲۳/۲۴؍اپریل ۲۰۱۴ء کو ابو اللیث ہال میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے طلبہ کا دو روزہ سیمینار بعنوان ''حدیث اور علوم حدیث'' منعقد ہوا۔ یہ سیمینار چار سیشن میں چلا۔ پہلے سیشن میں ۳؍مقالے پیش کیے گئے۔ صدارتی کلمات مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے پیش کیے۔ کلیدی خطبہ ناظم جامعہ کا ہوا۔ دوسرے اور تیسرے سیشن میں آٹھ مقالے پیش کیے گئے، جبکہ آخری سیشن میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ اس طرح مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب کی دعا پر سیمینار کا اختتام ہوا۔

گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جامعہ میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے سالانہ مسابقے منعقد ہوئے جس میں شعبہ حفظ، ثانوی اور اعلیٰ درجات کے طلبہ نے شرکت کی۔ قرأت، نظم، جنرل نالج، بیت بازی، عربی، اردو، ہندی اور انگریزی تقریری وتحریری مسابقہ ہوئے۔ طلبہ نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس میں شرکت کی، اس مسابقہ میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا جائے گا۔

۸؍مئی ۲۰۱۴ء بروز پنجشنبہ جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے ابو اللیث ہال میں سالانہ تعلیمی مظاہرہ منعقد ہوا۔ طلبہ نے عربی، اردو، ہندی، انگریزی تقاریر، نظم، ترانہ، پینل ڈسکشن، ڈرامے، مکالمے اور خاموش ڈرامہ کے ذریعہ اپنی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا۔ افتتاحی سیشن میں مولانا انیس احمد مدنی صاحب نے افتتاحیہ کلمات اور مولانا اسماعیل فلاحی صاحب نے صدارتی خطاب میں طلبہ سے تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے، محنت کرنے اور اپنے اندر اختصاص پیدا کرنے کی تلقین کی۔

یونٹس کے انتخابات

الحمدللہ طے شدہ پروگرام کے مطابق انجمن کی سرگرمیاں جاری ہیں اور انجمن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔مختلف یونٹوں میں انتخاب کا عمل جاری ہے۔اب تک موصولہ اطلاع کے مطابق:

کویت: کویت یونٹ کا انتخاب برادر محترم رحمت اللہ اثری فلاحی (رکن شوری) کی نگرانی میں ہوا جس میں درج ذیل بھائیوں کو بحیثیت ذمہ دار منتخب کیا گیا:

محمد منظور فلاحی (صدر یونٹ)، محمد سموئل فلاحی (سکریٹری) اور عمر فخری فلاحی (خازن)

کیرلا : کیرلا کا انتخاب برادر ابوالاعلی سید سبحانی (رکن شوری) کی نگرانی میں ہوا۔جس میں برادر ضیاء الرحمٰن فلاحی مدنی کو صدر، برادر ذوالقرنین حیدر سبحانی کو سکریٹری اور برادر مسرور احمد کو خازن کی ذمہ داریاں دی گئیں۔

علی گڑھ:علی گڑھ یونٹ کا انتخاب برادر ملک محمد فیصل (رکن شوری) کی نگرانی میں عمل میں آیا۔جس میں برادر ضیاء الدین ملک صدر منتخب ہوئے،جبکہ برادر خلیق الزماں سکریٹری اور برادر رفیع الدین خازن کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

لکھنؤ :لکھنؤ کا انتخاب صدر انجمن برادر رضوان احمد رفیقی کی موجودگی میں انجام پایا۔ برادر نجم الثاقب کو صدر، برادر ارشاد فلاحی کو سکریٹری اور برادر معظم فلاحی کو خازن منتخب کیا گیا۔

قطر : قطر یونٹ کے انتخاب میں مرکز سے کسی کی شرکت نہیں ہوسکی، البتہ یہاں برادر اکرم فلاحی کو صدر، برادر فیاض احمد فلاحی کو سکریٹری اور برادر افضل احسن فلاحی کو خازن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

اس کے علاوہ دیگر یونٹس کا انتخاب بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ممکن نہیں ہوسکا ہے۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ سبھی بھائیوں کو بحسن وخوبی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین

تفہیم وتدبر کے پچاس پچاس سیٹ کا ہدیہ

یہ خبر بھی فلاحی برادران کے لئے باعث مسرت ہوگی کہ ابھی حال ہی میں انجمن نے مادر علمی کی لائبریری کو تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کے پچاس پچاس سیٹ کا ہدیہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔الحمدللہ مذکوہ تعداد میں یہ سیٹ ارسال کیے جاچکے ہیں۔

جامعہ میں ''سیرت اور علوم سیرت'' پر لکچر سریز

گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی جامعہ میں انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے ''سیرت اور علوم سیرت'' کے

موضوع پر ۸/اپریل ۲۰۱۴ء سے لکچر سریز کا آغاز ہوا جس میں عالمیت اور فضیلت کے طلبہ نے شرکت کی۔ ان لکچرز کا مقصد تھا کہ طلبہ کو سیرت کے مآخذ و مصادر سے باخبر کیا جائے، اس کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور اسوۂ نبوی عملی میدان میں نمونہ بنایا جائے۔۔ ہر محاضرے کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہا۔ لکچرز سریز کی جھلکیاں کچھ اس طرح ہیں:

(۱)	۸/اپریل ۲۰۱۴ء	سیرت نبوی کے مطالعہ کی اہمیت و ضرورت:	مولانا اعجاز احمد قاسمی
(۲)	۹/اپریل ۲۰۱۴ء	کتب سیرت ایک مختصر تعارف:	مولانا عبدالرحمان زریاب فلاحی
(۳)	۱۷/اپریل ۲۰۱۴ء	سیرت نبوی میں رحمت کے مظاہر:	مولانا عمر اسلم اصلاحی
(۴)	۱۷/اپریل ۲۰۱۴ء	سیرت نبوی اور حقوق انسانی:	مولانا ابوسفیان اصلاحی
(۵)	۲۲/اپریل ۲۰۱۴ء	ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں بشارات محمدیہ:	مولانا ثناء اللہ
(۶)	۲۷/اپریل ۲۰۱۴ء	سیرت اور مستشرق:	مولانا عمیر صدیق دریا آبادی
(۷)	۲۹/اپریل ۲۰۱۴ء	اخلاق نبوی قرآن و سنت کی روشنی میں:	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
(۸)	۳۰/اپریل ۲۰۱۴ء	سیرت نبوی کی جھلکیاں سورۃ الاحزاب کی روشنی میں:	مولانا نعیم الدین اصلاحی
(۹)	۲/مئی ۲۰۱۴ء	عہد نبویؐ کا نظام سیاست:	مولانا محمد طاہر مدنی
(۱۰)	۵/مئی ۲۰۱۴ء	سیرت نبوی کی روشنی میں جنگ کے اخلاقی پہلو:	مولانا انیس احمد فلاحی
(۱۱)	۶/مئی ۲۰۱۴ء	محمد عربیؐ کے خصائص و امتیازات:	مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی
(۱۲)	۷/مئی ۲۰۱۴ء	اسوۂ نبوی عصر حاضر کے تناظر میں:	مولانا اخلاق احمد کریمی قاسمی

انجمن کی جانب سے جامعہ میں دو اساتذہ کی تقرری

امسال انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے جامعہ میں مزید علمی و فکری ماحول پروان چڑھانے کے لیے ایک پروگرام یہ بھی بنایا گیا کہ جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے فارغین جامعہ کو مناسب مشاہرے کے ساتھ جامعہ واپس لایا جائے۔

اس کے تحت جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم دو فلاحی برادران برادر عبیداللہ طاہر فلاحی اور برادر ذکی الرحمٰن غازی فلاحی کا جامعہ میں تقرر کیا گیا، الحمدللہ دونوں ہی ساتھی تدریس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

اس پروگرام کے تحت انجمن آئندہ دنوں بھی کچھ باصلاحیت فلاحی برادران کو ملک و بیرون ملک سے جامعہ واپس لانے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ واللہ ھو الموفق

ہر سال کی طرح امسال بھی جمعیۃ الطلبہ کو تعاون

ہر سال کی طرح انجمن کی جانب سے اس سال بھی طلبہ کی ہم نصابی سرگرمیوں کو مزید آگے بڑھانے کے لیے متعینہ مالی امداد روانہ کی گئی۔ الحمدللہ جمعیت کے سالانہ ترجمان 'الفلاح' کی اشاعت بھی عمل میں آ گئی ہے۔